Front Cover

جولائی 2014، قیمت 10 روپے

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

چمن میں برسات

Back Cover

BACHON KI DUNIYA Monthly, July 2014, Vol. 02, Issue: 07
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL (S) - 01/3439-2013-15
Date of Publication : 11/06/14
Date of Dispatch : 12 and 13 of Advance Month

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

اقبال کی کہانی

مصنف: جگن ناتھ آزاد
صفحات: 63
قیمت: 10/- روپے

بے زبان ساتھی

مصنف: وکیل نجیب
صفحات: 64
قیمت: 13/- روپے

ایک نائی اور رنگساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز
صفحات: 148
قیمت: 20/- روپے

دلچسپ کہانیاں

مصنف: رام آسرا راز
صفحات: 188
قیمت: 22/- روپے

چار درویشوں کا قصہ

مرتب: نور الحسن نقوی
صفحات: 95
قیمت: 16 /- روپے

ہمارے جاں باز

مصنف: پریم پال اشک
صفحات: 166
قیمت: 24/- روپے

بچوں کے حالی

مرتبہ: صالحہ عابد حسین
صفحات: 63
قیمت: 14/- روپے

نہرو کے ان دیکھے روپ

مصنف: بی ڈی ٹنڈن
مترجم: نور الحسن نقوی
صفحات: 218
قیمت: 23/- روپے

رابنسن کروسو

مصنف: ڈینیل ڈیفو، تلخیص: م۔ ندیم
صفحات: 62
قیمت: 13/- روپے

نورجہاں

مصنف: ایم آر کوہلی
صفحات: 45
قیمت: 14/- روپے

ہمالیہ کے بنجارے

مصنف: شیام سنگھ ششی
مترجم: کمال احمد صدیقی
صفحات: 96
قیمت: 16/- روپے

قصہ شیر کا شکاری کی زبانی

مصنف: اسرار احمد خاں دُرّانی
صفحات: 212
قیمت: 51/- روپے

گاندھی اہنسا کا سپاہی

مصنف: بی ڈی ٹنڈن، سوشیلا نائر
مترجم: محمد حسن متوسلی
صفحات: 144
قیمت: 21/- روپے

مشینی گھوڑا

مصنف: اطہر پرویز
صفحات: 143
قیمت: 12/- روپے

پوربی دیسوں کی کہانیاں

مصنف: کلا تیمرانی
مترجم: عائشہ صدیقی
صفحات: 341
قیمت: 39/- روپے

بچوں کا باغ

مصنف: ظفر کمالی
صفحات: 64
قیمت: 24/- روپے

گیت گاتے رہو

مصنف: شبنم کمالی
صفحات: 65
قیمت: 14/- روپے

بوستاں کی کہانیاں

مرتب: علقمہ شبلی
صفحات: 87
قیمت: 15/- روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi
جلد:2 شمارہ:7 جولائی 2014

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	2
سائنسی نظم	سورج کا خاندان	عبدالاحد ساز	3
دل چسپ خبریں	دنیا ایک عجائب خانہ	ادارہ	6
مضمون	سنت کبیر	رضوان رضوی	10
بارش کی نظمیں	برسات ہورہی ہے	خاور نقیب	12
	بارش جب بھی آتی ہے	شکیل خاں	13
	مینڈک کی دعا	اے آر جاوید	13
لذیذ معلومات	اہاہا! آئس کریم	بانو سرتاج	14
کہانیاں	بنٹی نام کا ایک لڑکا	م ناگ	18
	تجربے کا خزانہ	ساکجی ماکینو	20
	اللہ اور بھگوان	رونق جمال	23
	ہانڈی میں طوفان	جلیل اشروف	26
نظم	رشتہ مٹی کا	اشفاق الرحمٰن مظہر	32
یادیں	لطیفے، ہنسی اور اردو	ایم اے ڈی بوس	33
معلومات	اچھل کود کا چیمپئین اود بلاؤ	ریشما انجم	35
نظم	ایک گھنٹہ چڑیا گھر میں	فضل اللہ روی	37
کامکس	بھولے بھالو کی حماقتیں	ادارہ	38
نانی کا صندوق	بچے من کے سچے	ساحر لدھیانوی	42
مزاحیہ	ایک صبح کی بات ہے	نصرت ظہیر	43
سائنس	علم کا جادو گھر: جنتر منتر	محمد خلیل	49
قسط وار	فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	53
ننھے فنکار	بچوں کی تخلیقات	ادارہ	61
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	62
انٹرنیٹ سے	عجیب وغریب تصویریں	ادارہ	64

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر: نصرت ظہیر
ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل
NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون 49539000
شعبۂ ادارت: 11-49539009
ای میل
bachonkidunlya @ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
شعبۂ فروخت: فون: 26109746
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم،
نئی دہلی-110066
ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com
'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر
بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب
امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں
شاخ 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

آپس کی باتیں

پیارے جولائی کا مہینہ آ گیا۔ امید ہے سالانہ امتحانوں میں آپ اچھے نمبروں سے پاس ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ نئی کلاس ہوگی، نئی یونی فارم بنی ہوگی، نئی کتابیں آئی ہوں گی، نئے ٹیچر ہوں گے، نئے دوست ہوں گے۔ جو بچے پانچویں یا آٹھویں درجے میں کامیاب ہوئے ہیں ان میں تو بہت سوں کا اسکول بھی نیا ہوگا۔ اِدھر ملک میں سرکار بھی نئی آ گئی ہے جو خوب زور شور سے کام کر رہی ہے۔ غرض یہ کہ ہر طرف سب کچھ نیا ہی نیا ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ سب کو اور ہم سبھی سوا سو کروڑ ہندوستانیوں کو یہ تمام نیا پن مبارک ہو۔

اب ذرا اپنی نئی کتابوں پر نظر ڈالیے۔ نئی کتابیں پا کر آپ کو یقیناً خوشی ہوئی ہوگی۔ ہمارے بچپن کے دنوں میں اکثر بچے گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتے ہی امتحان کے نتیجے کے علاوہ اگر کسی چیز کا بے تابی سے انتظار کرتے تھے تو وہ ہوتی تھیں نئی کتابیں۔ جیسے ہی کامیابی کا نتیجہ ملنے کے بعد نئی کتابیں آتیں، ہم انھیں الٹ پلٹ کر دیکھتے، ان کے صفحوں کی خوشبو کو گہری گہری سانس لے کر سونگھتے، ان کی جلدیں بنواتے اور بڑے شوق اور محنت سے خوب صورت لکھاوٹ میں ان پر اپنا اور اپنے اسکول کا نام لکھتے۔ ہمارے ایک دوست تھے۔ ان کے غریب والدین نئی کتابوں کا خرچ نہیں اٹھا پاتے تھے۔ وہ بے چارے بازار سے ایک دو سال پرانا کورس آدھی قیمت پر خرید لاتے۔ لیکن ہمارے دوست ان کتابوں کو بہت سنبھال کر رکھتے۔ ان کے مڑے تڑے ورق سیدھے کرتے، پھٹے ہوئے ورق گوند سے یا میدے سے بنائی گئی لئی سے چپکا لیتے، پرانی کتابوں کی جلدوں کو بڑی احتیاط سے الگ کر کے ان کے گتے پر نیا کاغذ چپکا کر بالکل نیا روپ دے دیتے اور ان کی بنائی ہوئی جلد نئی جلد سے کہیں بہتر اور مضبوط ہوا کرتی۔ اس سے فارغ ہو کر وہ اسکول کھلنے کا انتظار کیے بغیر کتابوں کو کسی ناول یا کامکس بک کی طرح پڑھنا شروع کر دیتے۔ خاص طور سے سائنس، سوشل سائنس اور تاریخ کی کتابیں تو وہ اکثر اسکول کھلنے سے بہت پہلے ختم کر چکے ہوتے۔ اس کے بعد جب اسکول کھلتے اور کلاس میں ان کتابوں کے سبق پڑھائے جاتے تو ہم نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ ماسٹر صاحب نے کلاس سے کوئی سوال پوچھا ہو اور ہمارے دوست نے جواب بتانے کے لیے اپنا ہاتھ نہ کھڑا کیا ہو۔ عام طور پر کلاس میں اکیلے ان کا ہی جواب سب سے بہتر ہوا کرتا تھا۔ آج ہمارے وہ دوست ایک بڑی شخصیت کے مالک ہیں اور ایک بڑی کمپنی کی سربراہی کرتے ہیں۔

مجھے یقین ہے آپ بھی اپنی کتابوں سے محبت کرتے ہوں گے۔ کہتے ہیں کتابوں سے اچھا کوئی دوست نہیں۔ وہ آپ کو صرف دیتی ہیں لیتی کچھ بھی نہیں۔ لیکن دوست سے بھی بڑھ کر کتابوں کا درجہ یہ ہے کہ وہ آپ کی رہ نمائی کرتی ہیں۔ آپ کو آگے لے جاتی ہیں۔ آپ کی قابلیت بڑھاتی ہیں۔ اس لیے اپنی کتابوں کو چھپے ہوئے کاغذ کا ڈھیر نہیں اپنا دوست اور اپنا رہنما سمجھیے۔ انھیں اپنا بنا لیجیے۔ ان سے محبت کر کے دیکھیے۔ کورس کی بھی اسکولی کتابیں، جو آپ کو بہت بور اور بڑی خشک لگتی ہیں، الف لیلہ اور ملا نصر الدین کی کہانیوں سے زیادہ دل چسپ بن جائیں گی۔ پڑھائی کے دنوں میں جو کتابیں آپ کے لیے بوجھ بن جاتی ہیں ذرا سا ان کا ہاتھ تھام لیجیے، پھر دیکھیے وہ کیسے آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس دنیا کی سیر کرا دیتی ہیں! یاد رکھیے۔ کتاب کا درجہ ماں سے کم نہیں ہے۔ جس طرح ماں اپنے آپ بچے کی ہر ضرورت کو محسوس کر لیتی ہے اور بنا مانگے اسے سب کچھ دیتی رہتی ہے اسی طرح کتابیں بھی اچھی طرح جانتی ہیں کہ آپ کو کیا چاہیے۔ چنانچہ وہ بھی بنا طلب کیے بہت کچھ دیتی رہتی ہیں۔ امید ہے ان سطروں کو پڑھنے کے بعد آپ اپنی کتابوں کو ایک نئی نظر سے دیکھیں گے اور انھیں ایک نئے ڈھنگ سے اپنائیں گے۔

دوستو اس مہینے کے آخری ہفتے میں عید الفطر اپنی سوئیاں اور شیر بینیاں لے کر آ رہی ہے۔ لیکن جب یہ آئے گی تب 'بچوں کی دنیا' کا اگست کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اس لیے عید کا (اور ملک کے 68 ویں یوم آزادی کا) باقاعدہ مضامین کے ساتھ خیر مقدم ہم اسی شمارے میں کریں گے۔ فی الحال اجازت دیجیے۔ آپ کا دوست

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

عبدالاحد ساز

شام ڈھلی وہ سورج ڈوبا، نکلی تاروں کی بارات
دل میں ایک تجسس جاگا، ذہن میں پھر ابھری اک بات
کیسی سہانی روشنیاں ہیں، کیا دلکش نظارے ہیں
آخر کیا یہ بھیدا انوکھے، کھیل نرالے سارے ہیں
اماں باجی تو کہتی تھیں چاند میں پریاں رہتی ہیں
لیکن سائنسدانوں کی تحریریں کیا کچھ کہتی ہیں

آؤ بچو! آسمان کو دوربین سے دیکھیں ہم
بھرے پرے پھیلے آکاش کو کچھ نزدیک سے جانیں ہم
یہ جو جگمگ پلکیں جھپکاتے ہیں، وہ تو تارے ہیں
اور جو یکساں روشن سے لگتے ہیں وہ سیارے ہیں
تارے کیا ہیں؟ بحث ہے لمبی ان سے بعد میں الجھیں گے
آج فقط ہم سورج کے نو سیاروں کو سمجھیں گے

کہتے ہیں کہ اربوں سال گئے یہ سورج تنہا تھا
کاہکشاں کی راہ گزر پر مارا مارا پھرتا تھا
اک دن اس کے پاس سے گزرا ایک ستارہ طاقتور
اک ہلچل سی پیدا کردی جس نے سورج کے اندر

اس کی کشش نے سورج سے کچھ ٹکڑے کھینچ نکالے تھے
ٹکڑے جو آگے چل کر سیارے بننے والے تھے
اصل میں یہ نو سیارے سورج ہی کے گھر والے ہیں
اسی کے تن سے پھوٹے ہیں اور اسی کی گود کے پالے ہیں
جب سے جنمے ہیں تب سے ہیں سورج ہی کے گرد رواں
اپنا دائرہ پورا کرتے اپنے محور پر گرداں
سورج ہی کے نور سے ان کے سوئے چہرے ہیں روشن
سورج ہی کی دولت سے ہیں بھرے ہوئے ان کے دامن

پہلا سیارہ ہے عطارد، خاندان کا پہلا فرد
یگ یگ سے جو جھیل رہا ہے سورج کی قربت کا درد
آسانی سے نظر نہ آئے ، ننھا سا شرمیلا سا
اک جانب شعلے سا دہکتا، ایک طرف برفیلا سا

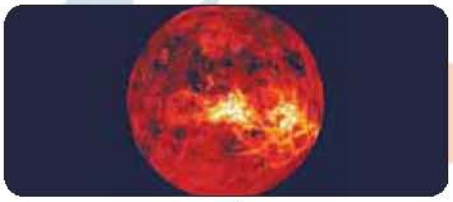

زہرہ دوسرا سیارہ ہے، دیکھنے میں ہے صاف بہت
اس کی سطح بڑی چمکیلی، گرم بہت شفاف بہت
اس کو صبح کا تارا کہیے، شام کا تارا بھی کہیے
صحرا کے بے سمت سفر میں اس کو اشارہ بھی کہیے

تیسرا نمبر اپنا کرۂ ارض اپنی محبوب زمیں
جس کے نیلے مکھڑے پر ہے کرنوں کا آنچل زریں
اس کی سہانی صبحیں شامیں، اس کے دلکش ہیں موسم
اس پر خاص رہا کرتی ہے آفتاب کی چشم کرم
لاکھوں سال پرانی ہے پر آج بھی ہر دم تازہ ہے
کیونکہ اس جنت کو خدا نے آکسیجن سے نوازا ہے
دوسرے سیارے تو فقط ہیں صدیوں کے بے جان حجر
اور زمیں پر آب وہوا ہے سبزہ وگل حیوان وبشر

یہ ہے زمیں کے ساتھ زمیں کے چکر کاٹنے والا چاند
نیا، ادھورا، پورا، کچھ دن روشن، پھر مدھم، پھر ماند
تم کو خبر ہے سورج چاند اور دھرتی کا کیا رشتہ ہے
سورج کی بیٹی ہے زمیں اور چاند زمیں کا بیٹا ہے

گھر کی چھت سے دیکھیں تو لگتا ہے دور کا سپنا ہے
خلا میں جاکر دیکھیں تو یہ نقش ہمارا اپنا ہے
اب ہم اس کو جیت چکے ہیں ہم اس کو چھوآئے ہیں
اور تحفے میں اپنے لیے ہم چاند کی مٹی لائے ہیں

نیل گگن پر اپنی زمین کا چھوٹا بھائی ہے مریخ
کچھ کچھ کرۂ ارض سے ملتی جلتی ہے اس کی تاریخ
سرخی مائل رنگ ہے اس کا ٹھیک نظر آجاتا ہے
اب اس پر جانے کا سودا اپنے سر میں سماتا ہے
علم فلک کے ماہر اس میں کھوج رہے ہیں امکانات
لیکن اب تک یہی خبر ہے، اس پہ نہیں ہے کوئی حیات

آگے بڑھ کر دیکھیں تو مشتری کا منظر پیارا ہے
اپنے نظام شمسی کا یہ سب سے بڑا سیارہ ہے
ایسی قامت، اتنی جسامت، گویا خود اک سورج ہو
آخر یہ فرزند بڑا ہے، کیوں نہ ایسی سج دھج ہو

زحل ہے وہ شہزادہ جو ہے سب سے زیادہ پراسرار
اس کے گرد کھینچا رہتا ہے چمکیلے رنگوں کا حصار

آسمان میں تیر رہا ہے اک خوش رنگ سفینے سا
آفتاب کے خاندان کے اک انمول نگینے سا

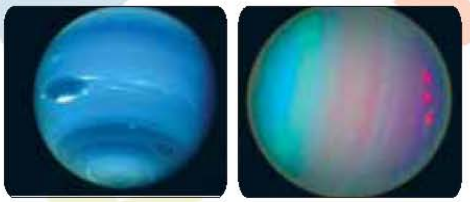

ہفتم اور ہشتم سیارے ہیں یورینس اور نیپچون *
یہ ہم سے ہیں دور بہت اور سرد بہت ہے ان کا خون ♦
دیر سے یہ دریافت ہوئے ہیں بڑے ہیں لیکن ہیں مدھم
ہیں تو اپنے ہی لیکن ہم واقف ہیں ان سے کم کم

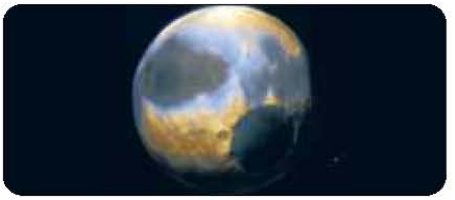

چھوٹے سے پریوار کا اپنے پلوٹو آخری ممبر ہے
ننھا سا ہے، اس کا رقبہ عطارد سے بھی کم تر ہے
اتنی دور کہ سورج واں سے اک نقطہ سا لگتا ہے
اس کے آگے کا منظر گھر کے باہر کا لگتا ہے

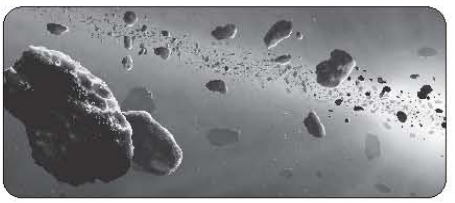

سنتے ہیں پلوٹو کے پیچھے دم تاروں کا ڈیرا ہے X
لیکن کیوں ہے کیسے ہے یہ اب بھی ایک معمہ ہے
یہ اپنے ماں جائے نہیں پر گھر میں آتے جاتے ہیں
سیاروں کے بنے بنائے رستوں پر اِٹھلاتے ہیں
برسوں میں آتے ہیں یہ مہمان مگر ڈرتے ہیں ہم

اپنی زمیں کے ان سے بچ رہنے کی دعا کرتے ہیں ہم
اس سارے کنبے کو لے کر سورج ہے کس سمت رواں؟
یہ تو خدا ہی جانے بابا، ہم سے کیا پوچھو ہو میاں!
آخر اپنا سورج بھی تو لے دے کر اک تارا ہے
کاہکشاں کے جنگل میں گھر بار لیے آوارہ ہے
لاکھوں کاہکشائیں ہیں اور ان میں کروڑوں تارے ہیں
سب کے اپنے اپنے مرکز، اپنے اپنے دھارے ہیں
فاصلے، جن کی پیمائش میں صدیاں بیتیں، کال لگیں
میلوں کوسوں کی کیا گنتی، کتنے 'نوری سال' لگیں ▲

قدرت کے سارے رازوں سے کوئی بھی آگاہ نہیں
کائنات بے انت ہے بچو! اس کی کوئی تھاہ نہیں
ہم سب اتنا جان سکے ہیں، آگے کی تم جانو گے
آج کے اَن دیکھے جلووں کو کل تم ہی پہچانو گے

□

*یورینس، نیپچون اور پلوٹو کے عربی نام غیر مانوس ہیں اس لیے انگریزی نام استعمال کیے گئے۔ ♦ سورج سے بے انتہا دوری کے باعث ان سیاروں پر درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بہت نیچے رہتا ہے اور انھیں سرد سیارے یا Cold planet کہا جاتا ہے۔ X کہا جاتا ہے کہ پلوٹو کے پرے نظامِ شمسی سے باہر دم تاروں کی آماجگاہ (CometDen) ہے، جہاں سے وہ نظامِ شمسی میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ ▲ نوری سال = Light Year

Abdul Ahad Saaz Mohd. Haji Aadam & Company 84, Chakla Street Mumbai-400003

□ ادارہ

دنیا ایک عجائب خانہ

زمین پر مریخ: برطانیہ کے علاقہ اسٹیون ایج کو یوروپ کے انجینیئروں نے سیارۂ مریخ کی زمین کی شکل میں بدل دیا ہے تاکہ اس پر اُن روبوٹ اور روبوٹک مشینوں کو ٹیسٹ کیا جا سکے جنھیں مستقبل کے مریخ مشن پر بھیجا جائے گا۔ اس میں مریخ کی سطح کا ماحول اور درجہ حرارت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناکارہ سی ڈیز کا خوب صورت استعمال: کمپیوٹر یا ویڈیو پلیئر پر چلنے والی سی ڈی یا Compact Disc ذرا سی بد احتیاطی سے خراب ہو جاتی ہیں اور انھیں پھینک دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ اگر آپ کے پاس ایسی سی ڈیز ہوں تو انھیں بلغاریہ کی راجدھانی صوفیہ کے ان رضا کاروں کی طرح کام میں لانے کی کوشش کیجیے جنھوں نے 6 ہزار سے زائد ناکارہ سی ڈیز کو باریک تاروں سے آپس میں باندھ کر مقامی پارک میں اس کے داخلی دروازے پر لٹکا دیا ہے۔ لوگ اس خوب صورت استقبال سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ سوچیے۔ سوچیے۔ آپ بھی اپنی بے کار سی ڈیز کا ایسا ہی کوئی بہتر استعمال یا ڈیزائن سوچیے۔

زلف کی طاقت: زلفوں کو حسن کی پہچان مانا جاتا ہے مگر کیا وہ اتنی طاقت ور بھی ہو سکتی ہیں! لندن میں پچھلے دنوں 43 سال کی محترمہ سیمون گینٹر یوک نے ایک گول رنگ سے لٹک کر اپنے گیسوؤں میں بندھی ہوئی 75 کلوگرام وزن کی واشنگ مشین کو کئی منٹوں تک اٹھائے رکھا اور لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ ایریل ایکروبیٹنگ کی ماہر یہ خاتون اپنے بالوں کی چوٹی میں باندھ کر آپ کو بھی لٹکا سکتی ہیں۔

ایپل یعنی سیب کا نیا ورژن: سیب پر یہ سرخ اور پیلے رنگ پینٹ نہیں کیے گئے ہیں۔ یہ قدرتی رنگ ہیں۔ یہ نایاب سیب آسٹریلیا کے شہر کنگسٹن میں مسز میل اسٹیپلو کے باغ میں پایا گیا۔ دوہری رنگت کا ایسا ہی ایک سیب 2009 میں ایک برطانوی کسان کے یہاں اگا تھا۔

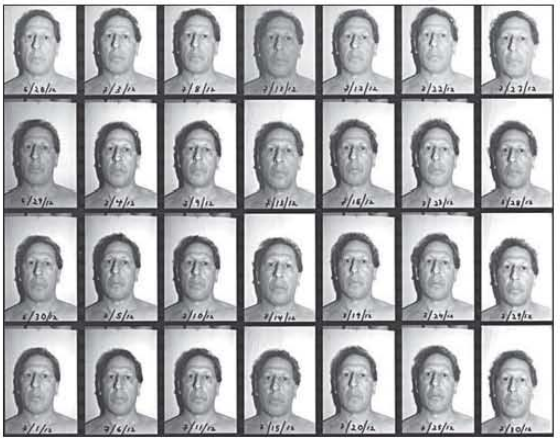

ایک شخص ہزار فوٹو: امریکہ کے کارل بیڈن ان لوگوں میں ہیں جنھیں مستقل مزاجی کا بادشاہ کہا جاسکتا ہے۔ 61 سالہ کارل بیڈن 34 سال کی عمر سے ہر روز صبح کو اپنی تصویر کھینچتے آرہے ہیں۔ صبح اٹھتے ہی ان کا سب سے پہلا کام فوٹو کھینچنا ہوتا ہے۔ 27 برسوں میں ان کے پاس اپنے ساڑھے نو ہزار فوٹو جمع ہو گئے ہیں جو ایک ہی کیمرے سے کھینچے گئے ہیں اور ہر فوٹو پر تاریخ درج ہے۔ اس کام نے انھیں خاصی شہرت دلا دی ہے۔ وہ ایک پیشہ ور آرٹسٹ ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ موت آنے تک وہ اس عمل کو جاری رکھیں گے۔ دیکھیے کب تک یہ عمل جاری رہتا ہے۔ ہماری دعا تو یہی ہے کہ خدا انھیں لمبی عمر دے۔

روشنی کے بادل؛ امریکی ریاست فلوریڈا کی آرٹسٹ جینیٹ ایچل مین ان دنوں فضا میں روشن ہونے والے بادل بنانے میں مصروف ہیں جنھیں وہ مچھلی پکڑنے کے جال کی مدد سے بناتی ہیں۔ یہ رنگین جال باریک تار کے ذریعے اونچی عمارتوں سے باندھ دیے جائیں گے اور رات کو جب یہ لہرائیں گے تو یوں لگے گا جیسے آسمان میں رنگین بادل تیر رہے ہیں۔ مارچ میں یہ بادل کینیڈا کے وینکوور شہر میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس کے موقع پر لہرائے گئے تھے۔

شہد کے چھتّے اور آرٹ: آرٹسٹ حضرات اپنے فن کو سامنے لانے کے لیے طرح طرح کے طریقے اپناتے رہتے ہیں۔ کینیڈا کی اگاتھا ڈِک نے شہد کی مکھی کے چھتّے کو اپنے فن کا میڈیم بنایا ہے۔ اس فنکارہ نے مٹی کے مجسموں پر مکھی کے چھتّوں کی مدد سے اپنے فن کا اظہار کیا ہے۔ ڈِک کا کہنا ہے کہ یہ سب وہ دنیا بھر میں تیزی سے کم ہوتی ہوئی شہد کی مکھیوں کی اہمیت بتانے کے لیے کر رہی ہیں۔

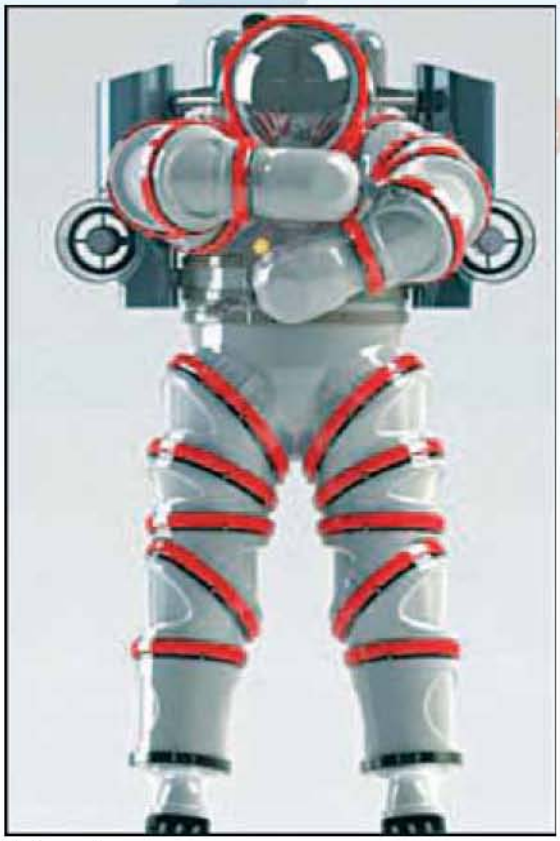

سمندر کی تہہ میں چہل قدمی: معاف کیجیے یہ کوئی خلاباز نہیں اور نہ ہی یہ خلائی لباس ہے۔ یہ سمندر کی تہہ پر چلنے کے لیے بنایا گیا لباس ہے۔ سمندر کی تہہ پر پانی کا اتنا سخت دباؤ ہوتا ہے کہ انسانی جسم اس میں پوری طرح پچک کر رہ جائے گا۔ پھر وہاں آکسیجن بھی نہیں ہوتی۔ مگر اس لباس میں دباؤ کو سہنے کی بھی طاقت ہوتی ہے اور آکسیجن بھی اتنی کہ 50 گھنٹوں کے لیے کافی ہے۔ یہ ایگزوسوٹ کہلاتا ہے اور اسے کینیڈا کے شہر وینکوور کی نائٹ کو ریسرچ کمپنی نے دھات سے بنایا ہے۔ اس میں 18 جوڑ لگائے گئے ہیں۔ لباس کے ساتھ ایسے سبھی اوزار فٹ ہوتے ہیں جن سے سمندر کے اندر لگائی گئی مشینوں وغیرہ کی مرمت کی جا سکے۔ سمندری تحقیقات میں لگے غوطہ خوروں کے لیے بنائے گئے اس لباس کی قیمت 6 لاکھ ڈالر ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ غوطہ خور سمندر کی اندرونی سطح پر چل پھر بھی سکیں گے۔

360 ڈگری کی دوڑ: تین سو ساٹھ ڈگری کا مطلب ہے مکمل دائرہ۔ اگر آپ سے کسی میدان پر ایک دائرے میں دوڑنے کو کہا جائے تو آپ جھٹ دوڑ پڑیں گے۔ لیکن یہ دائرہ اگر اوپر سے نیچے یعنی عمودی رخ پر ہو، یعنی ایک بڑے پائپ میں گول گھومتے ہوئے دوڑنا پڑے تو ایک چکر لگانے میں بھی پسینے چھوٹ جائیں گے اور سر الگ پھوٹے گا۔ برطانیہ کے 32 سالہ سابق جمناسٹ اور اسٹنٹ مین ڈیمئین والٹرز کے سامنے جب یہ چیلنج آیا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔ انھوں نے بڑے گھیر والے پائپ کے اندر فوم کے گدّے بچھائے اور اور کئی بار لوپ میں دوڑنے کی پریکٹس کی۔ آخر انھیں کامیابی ملی اور وہ 360 ڈگری زاویے پر لوپ بنا کر دوڑنے والے دنیا کے پہلے شخص بن گئے۔

پانی کے بغیر کپڑوں کی دھلائی: جن گھروں میں پانی کی کمی ہے وہاں کپڑے دھونا دھلوانا ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے جس کا حل برطانیہ کے ماہرین نے ڈھونڈھ لیا ہے۔ ایک کمپنی نے ایسی واشنگ مشین تیار کی ہے جو پانی کے بغیر کپڑے دھوتی ہے۔ مشین میں نائلون

کے تار اور ذرات استعمال کیے جاتے ہیں جو کپڑوں کے ریشوں سے میل نکالتے ہیں اور سیکڑوں دھلائیوں کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ یہ زیروس Xeros ٹیکنالوجی کہلاتی ہے جس سے برطانیہ میں ہی صرف ایک ہفتے میں سات ملین ٹن پانی کی بچت ہوسکتی ہے۔

تیلیوں کا محل: ایک امریکی آرٹسٹ نے یہ محل ماچس کی چار لاکھ 20 ہزار تیلیوں سے یہ محل نما قلعہ تیار کیا ہے۔ یہ قلعہ اس نے مشہور ہالی وڈ فلم لارڈ آف دی رنگز میں دکھائے جانے والے قلعے سے متاثر ہوکر تیار کیا ہے۔ تیلیوں کی اس آرٹ کے ماہر دوسرے ملکوں میں بھی ملتے ہیں۔

مونگ پھلی آرٹ: روسی فوٹو گرافر نیلیہ شوارز نے مونگ پھلی کو اپنے فن کی نمائش کے لیے کردار کی شکل دے دی ہے۔ اچھی اچھی مختلف سائزوں کی مونگ پھلیاں چن کر وہ ان کی تصویریں مختلف کرداروں کو ذہن میں رکھ کر کھینچتی ہیں۔ ان تصویروں میں کوئی مونگ پھلی بارش میں چھتری لیے کھڑی ملتی ہے، کوئی پانی بھرے پیالے میں کودنے کو تیار کھڑی نظر آتی ہے تو کوئی دوسری مونگ پھلی سے لڑ رہی ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مونگ پھلی آرٹ کا نام دے سکتے ہیں۔

کچھوے کی مرمت: اس زخمی کچھوے کے ڈاکٹروں کو آپ میکینک بھی کہہ سکتے ہیں۔ برطانیہ کے اس کچھوے کی اگلی دونوں ٹانگیں کسی حادثے میں زخمی ہوگئی تھیں اور کچھوا دوبارہ پیروں سے نہیں چل سکتا تھا۔ جانوروں کے اسپتال میں ڈاکٹروں نے پیروں کی جگہ دو ٹائر فٹ کردیے جن کی مدد سے کچھوا آہستہ آہستہ چلنے کے قابل ہوگیا۔

کتوں کا اسمارٹ فون: پالتو کتوں کو گھر پر اکیلے چھوڑ کر جانا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن اب اس کا حل ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ پالتو کتوں کے لیے ایک فون 'اسمارٹ ڈاگ' کے نام سے آگیا ہے جس میں ویب کیمرے اور مائکروفون کے ساتھ ایک بسکٹ ڈسپنسر فٹ ہے۔ فون کو دیوار پر فٹ کرکے کتے کو اس کے کیمرے کی رینج کے اندر باندھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح دور سے کتے پر نظر رکھی جاسکتی ہے اور ضرورت پڑنے پر اسے مناسب ہدایات دینے کے علاوہ بسکٹ بھی دیے جاسکتے ہیں۔ □

□رضوان رضوی

سنت کبیر

پیارے بچو! ہمارے ملک میں کبیر نام کے ایک بزرگ گزرے ہیں۔ آپ نے پہلے بھی ان کا نام سنا ہوگا اور کہیں نہ کہیں آپ کی اسکول کی کتابوں میں ضرور ان کا ذکر آیا ہوگا۔ کبیر اُن بڑے لوگوں میں گنے جاتے ہیں جنھوں نے ہندوستان کو صحیح معنوں میں ہندوستان بنایا۔ حضرت امیر خسرو، رحیم، رسکھان (رس خان)، ملک محمد جائسی، تلسی داس، سورداس اور بابا فرید گنج شکر کی طرح کبیر نے بھی ہم ہندوستانیوں کی سوچ پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ حالانکہ انھوں نے بڑی غریبی میں زندگی گزاری اور وہ خاص پڑھے لکھے بھی نہیں تھے۔

کہتے ہیں کہ کبیر ایک بیوہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور بیوہ نے سماج کی شرم سے انھیں ایک تالاب کے کنارے پھینک دیا تھا۔ اصل حقیقت کیا ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔ آگے اس روایت میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ شیر ونام کا ایک کپڑا بننے والا اس راستے سے گزر رہا تھا کہ بچے کے رونے کی آواز سن کر وہ اس کے پاس گیا۔ بچے کو اٹھا کر وہ اپنے گھر لے آیا اور اپنی بیوی نیا کو دے دیا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے نیا اس بچے کو پا کر بہت خوش ہوئی۔ دونوں نے بچے کا نام کبیر رکھ دیا۔ کبیر جب بڑے ہوئے تب کپڑے بننے کا کام کرنے لگے۔ لیکن کبیر کا دل اس کام میں نہیں لگتا تھا وہ برابر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔

ایک دن وہ پیر بزرگ کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ اس زمانے میں مہاتما رامانند بڑے اچھے پیر بزرگ مانے جاتے تھے۔ مگر مہاتما رامانند صرف اونچی ذات والوں کو ہی اپنا شاگرد بنایا کرتے تھے۔ جب یہ بات کبیر کو معلوم ہوئی تو وہ ایک دن صبح سویرے گنگا کے گھاٹ کی سیڑھی پر جا کر چپ چاپ لیٹ گئے۔ ٹھیک اسی وقت مہاتما رامانند گنگا میں غسل کرنے آئے۔ اتفاق سے رامانند کی کھڑاؤں کبیر کے ماتھے سے ٹکرا گئیں۔ رامانند جی کے منہ سے 'رام رام' کا لفظ نکلا۔ کبیر نے اسی وقت خود کو مہاتما رامانند جی کا شاگرد مان لیا۔

بچو! سنت کبیر کسی خاص مذہب کے ماننے والے نہیں تھے۔ انھوں نے ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنا شاگرد بنایا۔ ہندو دھرم کے ماننے والے انھیں ہندو اور مسلمان مذہب کے ماننے والے انھیں مسلمان مانتے تھے۔ وہ توہم پرستی کے خلاف تھے۔ ذات پات اور مذہب کے فرق کو نہیں مانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کا خدا، رب یا ایشور تو خود انسان کے دل میں ہوتا ہے اور اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ تو اپنے من میں ہی خدا کو پالیتی ہے۔ وہ بت پرست نہیں تھے اور صرف ایک خدا میں یقین رکھتے تھے۔ ان کی باتیں بڑی سیدھی سادی اور دل و دماغ کو چھو لینے والی ہوتی تھیں۔ ان کے کہے ہوئے دوہے سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب میں شامل ہیں جس میں بابا فرید گنج شکرؒ کے صوفیانہ کلام کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ مہاتما کبیر کی تعلیمات پر یقین رکھنے والے خود کو کبیر پنتھی کہتے ہیں اور ہندوستانی ادب میں کبیر کا بہت اونچا مقام ہے۔

روایت مشہور ہے کہ آخری وقت میں سنت کبیر نے اپنے ہندو اور

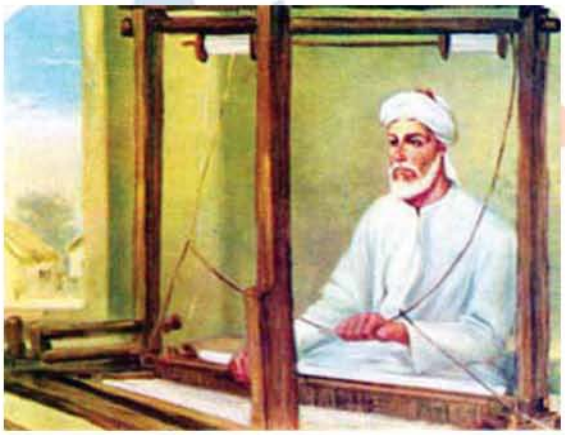

مسلمان شاگردوں کو بلا کر کہا ”میرے پیارے شاگردو! میرے مرنے کے بعد تم لوگ آپس میں لڑنا نہیں، بلکہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق میری آخری رسم ادا کرنا۔“

ایک دن کبیر داس اچانک ایک چادر لپیٹ کر لیٹ گئے اور فوراً ہی ان کی روح پرواز کر گئی۔

ہندو شاگردوں نے ان کی لاش کو جلانے کے لیے اور مسلمان شاگردوں نے دفن کرنے کے لیے ضد شروع کر دی۔ دونوں کافی دیر تک اپنی اپنی ضد پر اڑے رہے۔ آخر کار جب کسی نے ان کی لاش سے چادر ہٹائی تو وہاں لاش کی بجائے پھولوں کا ایک ڈھیر ملا۔ یہ منظر دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ ان پھولوں کو ہندو اور مسلمان شاگردوں نے آپس میں برابر برابر تقسیم کر کے اپنے اپنے عقیدے اور مذہب کے مطابق عمل کیا۔ ہندوؤں نے پھولوں کو جلا کر ان کی راکھ سمادھی میں ملا دی اور مسلمانوں نے پھولوں کو زمیں میں دفن کر کے مزار بنا لیا۔

بچو! یہ بھی جان لو کہ کبیر ہندوستانی زبان کے مشہور شاعر تھے اور اپنے پیغامات شعروں میں ہی دیا کرتے تھے۔ ان کے بہت سے شعر مشہور ہیں جو دوہے کہلاتے ہیں۔

کبیرا کھڑا بازار میں، مانگے سب کی خیر
نہ کاہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر

کال کرے سو آج کر آج کرے سو اب
پل میں پرلے ہوئے گی، بہوری کرو گے کب؟

برا جو دیکھن میں چلا، برا نہ ملیا کوئے
جو من کھوجا آپنا، تو مجھ سے برا نہ کوئے

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا، پنڈت بھیو نہ کوئے
ڈھائی آکھر پریم کے، جو پڑھے سو پنڈت ہوئے

جب تو آیا جگت میں، لوگ ہنسے تو روئے
ایسی کرنی نا کری، پیچھے ہنسے سب کوئے

مالا پھیرت جگ بھیا، گیا نہ من کا پھیر
کر کا منکا چھوڑ دے من کا منکا پھیر

ذات نہ پوچھو سادھو کی، پوچھ لیجیے گیان
مول کرو تلوار کا، پڑی رہن دو میان

گرو گوبند دونوں کھڑے کس کے لاگوں پائے
بلہاری گرو آپ کی، جن گوبند دیو بتائے

مائی کہے کمہار سے تو کیا روندے موئے
اک دن ایسا آئے گا، میں روندوں گی توئے

تو دیکھا تم نے۔ کتنی آسان سیدھی سادی اور عام آدمی کی بول چال میں سنت کبیر کیسی کیسی گہری باتیں کہہ گئے ہیں جو آج بھی سنتے ہی دل میں اتر جاتی ہیں۔ □

Mr Rizwan Rizvi Ashiyana, Binauliya, Bihar Shareef, Nalanda-803101 Bihar

نظم

خاور نقیب

برسات ہو رہی ہے

برسات ہو رہی ہے
گرمی کو دھو رہی ہے

پودے نہا رہے ہیں
پتے سجا رہے ہیں
تالاب گا رہے ہیں
بگلے بلا رہے ہیں
رم جھم کے تال سُر پر
برسات ہو رہی ہے
گرمی کو دھو رہی ہے

قطرے اچھل رہے ہیں
مینڈک مچل رہے ہیں
بچے نکل رہے ہیں
کیچڑ پہ چل رہے ہیں
رم جھم کے تال سُر پر
برسات ہو رہی ہے
گرمی کو دھو رہی ہے

کاغذ کی ایک کشتی
پانی پہ بہہ رہی ہے
لہروں کو سہہ رہی ہے
بچوں سے کہہ رہی ہے
رم جھم کے تال سُر پر
برسات ہو رہی ہے
گرمی کو دھو رہی ہے

برسات ہو رہی ہے
گرمی کو دھوا رہی ہے

Mr Khawar Naqeeb P O Kood, Sungra Distt Cuttack - 754221 Odisha

بارش جب بھی آتی ہے

شکیل خاں

بارش جب بھی آتی ہے
کھیت ہرا کر جاتی ہے
دامن کو یہ دھرتی کے
غلوں سے بھرجاتی ہے
بارش کم ہونے سے بچو!
فصل کھڑی مرجاتی ہے
دین دکھی کی کچی کٹیا
بارش سے ڈر جاتی ہے
خوشی پیٹ کے بھرجانے کی
بارش کے سر جاتی ہے
چمکاتی ہے بجلی چم چم
بادل کے سر جاتی ہے
چمکاتی ہے بجلی چم چم
بادل کو گرجاتی ہے
پہلی بارش جلتی بھنتی
دھرتی کو گرماتی ہے
بارش میں کاغذ کی ناؤ
ندی پار کرجاتی ہے
بارش میرے بچپن والی
آنکھوں کو بھرماتی ہے
بارش جب بھی آتی ہے
کھیت ہرا کرجاتی ہے

MrShakeel Khan
Urdu SectionBihar Legislative Council Patna-800015

مینڈک کی دعا

اے آر جاوید

مینڈک ٹر ٹر کرتا ہے
برسو بادل کہتا ہے
پانی برسے موج اڑائے
یہی دعا وہ کرتا ہے

کل پھر لوٹ کے آؤ تم
بادل بادل جاؤ تم
اور کہیں منڈلاؤ تم
آج ذرا ہم کھیلیں گے
کل پھر لوٹ کے آؤ تم

کھیتوں میں ہریالی چھائی
کالے کالے بادل آئے
رم جھم رم جھم بارش لائے
کھیتوں میں ہریالی چھائی
دہقانوں کی خوب بن آئی
فصلیں خوب اگائیں گے
خوشیاں خوب منائیں گے
مینڈک ٹر ٹر کرتا ہے

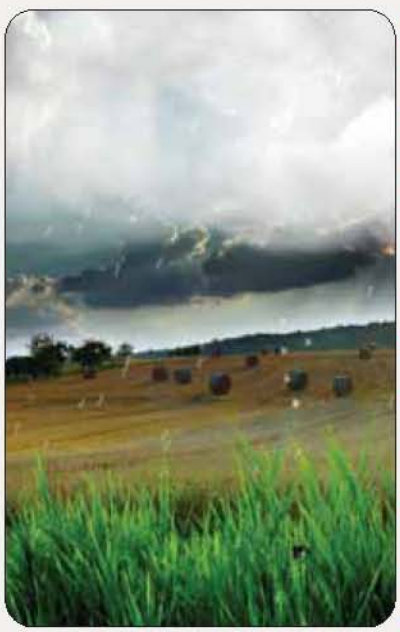

Mr A R Javed
145 Block G New All Pur Kolkata-700053

□ بانو سرتاج

آہا ہا! آئس کریم!

گرمیاں شروع ہوئیں نہیں کہ بچوں کو چاروں طرف آئس کریم نظر آنے لگتی ہے۔ بچوں کا بس چلے تو وہ آئس کریم کو موسم گرما کے ساتھ جوڑنے کی روایت ختم کردیں مگر گھر کے بڑے لوگوں پر ان کی صحت کی ذمہ داری بھی تو ہے۔ بارش اور سردی کے موسم میں آئس کریم نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اس لیے ہمارا خیال ہے کہ آئس کریم کو موسم گرما کے تحفہ کی حیثیت ہی سے دیکھنا چاہیے۔

آئس کریم سامنے آتے ہی بچوں کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے آہا ہا آئس کریم! مگر افسوس ہے بچو، ہم آپ کو آئس کریم نہیں پیش کررہے ہیں، آئس کریم کی کہانی سنا رہے ہیں۔ ذرا اپنی معلومات کا ذخیرہ بڑھالیں تو اچھا ہے۔ آئس کریم تو جائے گی پیٹ میں، ذرا دیر کا مزا، مگر اس کی کہانی ہمیشہ محفوظ رہے گی دماغ کی غذا بن کر۔

ملک روم کے ایک سائنسداں بلے سی لیس بلے فرینکا Bilecius Bile Franca نے برف پر کچھ تجربے کیے تو پایا کہ اگر برف میں نمک ملادیا جائے تو اس کی حرارت Temperature اتنی گر جاتی ہے کہ اس درجہ پر کریم جمائی جاسکتی ہے۔ فرینکا کی یہ دریافت آئس کریم بنانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ آئس کریم کا نام پہلے آئسڈ کریم Iced Cream یعنی جمی ہوئی کریم ہی تھا۔ رفتہ رفتہ گھس کر آئس کریم بن گیا۔ ایک اور واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دودھ

▲ چین سے آئس کریم یوروپ لے جانے والا سیاح مارکو پولو

ملکہ کیتھرین ڈی میدیسی جو اپنی شادی پر آئس کریم فرانس لے گئیں

کریم کی سوغات ملی۔

1533 میں آئس کریم اٹلی سے فرانس پہنچی۔ اٹلی کی کیتھرین ڈی میڈیسی Cathrene D Medici کی شادی کنگ فرانسس اول King Frances کے بیٹے سے ہوئی۔ وہ رانی بنیں۔ وہ اپنے ساتھ آئس کریم بھی لے گئیں اور آئس کریم فرانس بچوں میں مقبول ہوگئی۔ فرانس کی ہین ریٹا مارین Henrita Marin کی شادی 1960 میں چارلس Charles I سے ہوئی۔ ہنریٹا کو آئس کریم بہت پسند تھی۔ ان کا خصوصی باورچی ان کے ساتھ انگلینڈ گیا تو اس طرح پہلے شاہی خاندان میں اور پھر عوام تک آئس کریم پہنچ گئی۔ اس وقت آئس کریم بہت مہنگی تھی۔ ایک پونڈ میں ذرا سی آئس کریم ملتی تھی۔

انگلینڈ کے بادشاہ جیمس دوم James II کو بھی آئس کریم پسند تھی۔ 1986 میں اس کے آئس کریم کھانے کا ذکر ملتا ہے۔

سکندر نے فتح کا جشن مناتے ہوئے ایک مرتبہ عوام کے لیے آئس کریم تیار کروائی تھی۔ بڑے بڑے گڑھے کھود کر ان میں دودھ بھرا گیا اور جہازوں کے ذریعہ لائی گئی برف ملا کر آئس کریم تیار کی گئی تھی۔

آئس کریم عام طور پر پلیٹوں یا کپ میں پیش کی جاتی تھی۔ آج بھی کپ میں ہی زیادہ تر پیش ہوتی ہے۔ اس کے لیے خاص ڈیزائن والے نے غور کیا کہ گرمیوں میں کریم خراب ہوجاتی ہے۔ تو اس نے سوچا کیوں نہ اسے جما کر فروخت کیا جائے اور کریم کو جما کر بیچنے لگا۔ جلد ہی یہ بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی مقبول ہوگئی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یوروپی سیاح مارکو پولو چین کے سفر پر گیا تو پیکنگ (آج کا بیجنگ) میں جمی ہوئی کریم دیکھ کر بے حد حیران ہوا۔ جگہ جگہ ہاتھ گاڑیوں پر آئس کریم فروخت ہورہی تھی۔ بچوں کا اژدھام تھا۔ مارکو پولو آئس کریم بنانے کا طریقہ اٹلی لے آیا اور اس طرح اٹلی کے بچوں کو آئس

والے کپ تیار کیے جاتے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں الفریڈ ایل کریل Alfred L Crale نے خوبصورت کپ بنانے کا رواج شروع کیا۔

1857 میں امریکہ کے بالٹی مور شہر میں آئس کریم کی فیکٹری قائم ہوئی اور پھر 1870 میں انگلینڈ میں آئس کریم کا کارخانہ کام کرنے لگا۔

آیوبا کے ایک شخص ڈبلیو وال W Wall نے لکڑی پر آئس کریم بنانے کا آغاز کیا۔ قیمت بھی کم رکھی مگر تاجروں نے اس میں زیادہ دل چسپی نہیں لی۔ وال نے تین پہیوں کی سائیکل پر ڈبہ رکھ کر خود ہی بیچنا شروع کیا۔ جلد ہی تاجروں کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور انہوں نے باریا لکڑی پر بنائی گئی آئس کریم کے آرڈر دے دیے۔

امریکہ کے سینٹ لوئی شہر میں چارلس مین ویز Charles Menvez آئس کریم فروخت کرتا تھا۔ 1904 میں ایک میلے میں

اس نے آئس کریم کا اسٹال لگایا۔ ایسا زبردست رسپانس ملا کہ اسے کام سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ کپ پلیٹیں دھونے کے لیے مشکل ہونے لگی۔

اس کے بازو میں ایک سیریائی نوجوان کا جلیبیوں کا اسٹال تھا۔ چارلس نے دیکھا کہ کچھ لوگ جلیبیاں خریدتے اسے چپٹا کر کے کھاتے۔ اسے ایک نادر خیال آیا۔ اس نے جلیبیاں چپٹی کر کے رول کیا اور اس میں آئس کریم بھر دی۔

چارلس خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے باقاعدہ کُرکُرے رول تیار کئے۔ اسے 'کون' Cone نام دیا اور آئس کریم 'کون' میں بھر کر فروخت کرنے لگا۔ شاعرہ سدھا انوپم نے 'آئس کریم کون کی کہانی' نظم میں اس واقعہ کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ آپ بھی پڑھیں:

امریکہ کے سینٹ لوئی میں لگتا تھا اک میلہ
لوگ خریدی کرنے آتے لے کر پیسہ دھیلا
تپتی گرمی کے موسم میں ہوتی بھیڑ اپار
آئس کریم سے ٹھنڈک پانے ہوکر جن لاچار
چارلس مین ویز بیچا کرتا پلیٹوں میں آئس کریم
لوگ چمچ کر کھاتے جیسے ہو پورا کوئی ڈریم
سن انیس سو چار میں اگست ماہ کی گھٹنا
سینٹ لوئی یوں تپ رہا تھا جیوں گرمی میں پٹنہ
صبح سویرے سے ہی میلے میں جٹ گئی بھیڑ اپار
آئس کریم کھانے والوں کی لگنے لگی قطار
ممی پاپا دادا دادی تھے بچوں کے ساتھ
چارلس مین ویز چلا رہا تھا جلدی جلدی ہاتھ
بھاگ میں اس کے لکھا ہوا تھا ایک عجوبہ ہونا
پلیٹیں ساری گندی ہوگئیں مشکل ہو گیا دھونا
گاہک سر پر کھڑے ہوئے تھے کرتے چیخ پکار
کہیں اور وہ چلے گئے تو گھاٹے میں بیوپار
تبھی چارلس نے آزو بازو تیز نظر دوڑائی

وہیں پاس میں کھڑا ہوا تھا دوست ایک سیریائی
نام تھا اس کا ارنسٹ ہموی تھا وہ ایک ایشیائی
بیچ رہا تھا جلیبی پاپڑ جو تھی ایک مٹھائی
وہ سیریائی پاپڑ لے کر کیا چارلس نے رول
آئس کریم اندر بھرتے ہی رول ہوگیا خول
آئس کریم کے سنگ سبھی نے خول بھی اس کا کھایا
اس طرح سے آئس کریم کا کون جگت میں آیا

سن 1905 کے بعد آئس کریم مقبولیت کی انتہا پر پہنچ گئی۔ Refrigration کی تکنیک نے، جس سے ریفریجریٹر کام کرتا ہے، آئس کریم بنانا بہت آسان کردیا۔ اب تو آئس کریم کئی رنگوں، کئی قسموں، کئی خوشبوؤں کی ملنے لگی ہے۔ کون میں، بار کی شکل میں، پیالوں میں، دستیاب ہونے لگی ہے۔ مزے ہیں بچوں کے بھئی! □

Dr Bano SartajOpposite Akashwani Civil Lines Chandrapur-442401 MS

□م ناگ

بنٹی نام کا ایک لڑکا

بنٹی اسکول سے لوٹا تو ماں نیرو کو موسمی کا رس دے رہی تھی، بنٹی کو دیکھتے ہی بولی ''آ گیا بیٹا! جلدی سے منہ ہاتھ دھولو، میں کھانا لگاتی ہوں۔''

''میں کھانا نہیں کھاؤں گا، میں تو موسمی کا رس پیوں گا۔''

''میرے راجہ بیٹے، پہلے کھانا کھالو، پھر تھوڑا سا رس تمہیں بھی دے دوں گی۔''

''ہوں! تھوڑا سا کیوں؟ باجی کو تو روز گلاس بھر کر رس دیتی ہو، مجھے تھوڑا سا۔ مجھے نہیں چاہیے۔ اگر دینا ہے تو گلاس بھر کر دو۔'' بنٹی غصہ ہوا۔

ماں نے اسے سمجھایا، ''بیٹے نیرو بیمار ہے، وہ اور کچھ کھا نہیں سکتی، ڈاکٹر نے صرف رس دینے کے لیے کہا ہے۔''

ماں نے اپنی پریشانی بتائی۔

''جب باجی کو روز نہ پھلوں کا رس مل سکتا ہے، تو مجھے کیوں نہیں؟'' بنٹی نے پھر ضد کی۔

''بیٹے پھل بہت مہنگے ہیں، تم تو سب کچھ کھا پی سکتے ہو، نیرو رس کے سوا اور کچھ نہیں کھا سکتی، بے چاری کتنی بیمار ہے، اس کا کچھ تو خیال کرو۔''

''کیسی بیمار، ارے یہ تو عیش کر رہی ہے، سارا دن بستر پر پڑی آرام کرتی ہے، نہ

اسکول جاتی ہے۔کل سے میں بھی اسکول نہیں جاؤں گا اور نہ ہی کھانا کھاؤں گا۔"

ماں سمجھ گئی کہ بنٹی ضد پر اتر آیا ہے، اور اسے دوسری طرح سے سبق سکھانا ہوگا۔

شام کو ماں نیرو کو لے کر ڈاکٹر کے کلینک گئی۔بنٹی کو بھی ساتھ لے لیا۔ڈاکٹر نے تھرمامیٹر منہ میں لگا کر نیرو کا بخار دیکھا۔انھوں نے بچّی کو بہت سی دوائیاں دیں اور انجکشن بھی لگایا۔انجکشن لگانے سے نیرو رونے لگی۔بنٹی سے اپنی باجی کا درد دیکھا نہیں گیا۔اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔اسے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ باجی کو اتنی ساری کڑوی دوائیاں کھانی پڑے گی۔

بنٹی اور باجی ماں کے ساتھ گھر لوٹے، کچھ ہی دیر میں جہانگیر انکل آگئے وہ چاکلیٹ ، مٹھائیاں اور پھل لائے تھے۔

بنٹی بہت خوش ہوا،اس نے مٹھائیاں کھائیں۔اس نے چونک کر پوچھا"ماں تم نے تو مٹھائیاں بانٹ دیں، باجی کا حصہ نہیں رکھا۔"

"نہیں بیٹے! وہ نہیں کھائے گی، ڈاکٹر نے منع کیا ہے اور ہاں اسے چاکلیٹ بھی نہیں دکھانا۔"

بنٹی کو یہ سب اچھا نہیں لگا۔وہ بولا"ماں باجی کو پھل کھانے کے لیے دو۔"

ماں بولی"نہیں بیٹے پھل تو تمہارے کھانے کے لیے رکھے ہیں۔اسے پھل کا رس دوں گی اور تمہیں نہیں دوں تو تم ضد کرو گے اور کھانا نہیں کھاؤ گے۔"

"نہیں ماں! اب میں ضد نہیں کروں گا، بے چاری باجی کو کڑوی دوائی پینی پڑتی ہے، انجکشن بھی لگوانا پڑتا ہے اور وہ تو چاکلیٹ اور مٹھائیاں بھی نہیں کھا سکتی ۔مجھے رس نہیں چاہیے۔کیونکہ تمہارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تم ہم دونوں کو رس پلا سکو۔"

بنٹی نے ماں سے یہ کہا تو ماں بہت خوش ہوئی اور اس نے بنٹی کو گلے سے لگا کر کہا"میرا سمجھدار راجہ بیٹا!" □

Mr Meem Naag R No. 4, Jaya Talkies Compound Borivali (W) Mumbai-400092

□ سائجی ماکینو

ترجمہ: سلطان احمد اشک

تجربے کا خزانہ

بہت پرانے زمانے کی بات ہے، جاپان کے 'کینانو' نام کے علاقے میں ایک بہت ہی گھمنڈی راجہ راج کرتا تھا۔ ایک دن اس نے اعلان کر دیا کہ جو لوگ 70 سال سے زیادہ عمر کے ہو گئے ہیں انہیں ریاست سے نکال دیا جائے کیونکہ اس عمر کے لوگ کسی کام کے نہیں رہ جاتے۔ یہ اعلان سنتے ہی پوری ریاست میں کہرام مچ گیا اور رعایا میں سب کے سب راجہ کو کوسنے لگے۔

راجہ کے اس حکم سے مجبور ہو کر لوگ روتے ہوئے اپنے اپنے بوڑھے ماں باپ کو جنگل کی طرف لے کر چل دیے اور انہیں جنگل میں چھوڑتے ہوئے کہا، آپ ہمیں معاف کریں اور کچھ دنوں تک یہیں رہیں اور جنگلی پھل کھا کر گزارہ کریں۔ خدا نے چاہا تو ہم ایک دن آ کر آپ کو ضرور لے جائیں گے۔ یہ کہہ کر سب روتے پیٹتے اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔

اسی ریاست میں ایک نوجوان گینسوکے رہتا تھا۔ وہ بھی اپنی ماں کو پیٹھ پر بٹھا کر جنگل کو چل پڑا۔ راستے میں اس کی ماں ہاتھ بڑھا بڑھا کر پیڑ کی ٹہنیوں کو پکڑتی اور انہیں توڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر گینسوکے نے یہی سمجھا کہ ماں

شائد جنگل سے واپسی کے لیے نشان چھوڑ رہی ہے۔ پھر جیسے ہی وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر جانے لگا تو اس کی ماں بول پڑی:

''بیٹا تم اپنی صحت کا خیال رکھنا اور واپسی پر تم کہیں راستہ نہ بھول جاؤ اس لیے میں تمہارے واسطے راستے میں ٹہنیاں گراتے ہوئے آئی ہوں۔'' یہ سن کر گینسو کے رونے لگا اور بول پڑا:

''ماں تم کتنی اچھی ہو، اس حالت میں بھی تمھیں صرف میری فکر ہے میں تمھیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ نہیں میں تمھیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ کبھی نہیں'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی ماں کو واپس پیٹھ پر بٹھایا اور گھر چلا آیا۔ وہ ماں کو سب سے چھپا کر گھر میں رکھنے لگا۔

وقت گذرتا گیا اور لوگ اداس رہنے لگے۔ انہیں ہمیشہ اپنے ماں باپ کی فکر ستاتی تھی۔ ان کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا اور ڈھنگ سے کھیتی باڑی تک نہیں کر پاتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ لگان بھی نہیں دے پا رہے تھے۔ اس طرح آہستہ آہستہ پورے ملک کی حالت بگڑتی چلی گئی۔

جب یہ بات راجہ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے حکم جاری کیا۔

''جو لوگ اپنے بزرگوں کو واپس لانا چاہتے ہیں تو انہیں پہلے دربار میں راکھ کی رسی بنا کر پیش کرنی ہوں گی، یہ ہماری ایک شرط ہے

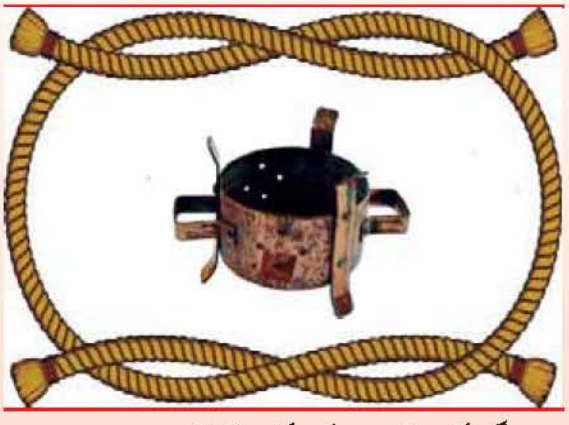

جسے بزرگوں کو لانے سے پہلے پورا کرنا ہوگا۔''

یہ کیسی شرط ہے بھلا؟ راکھ سے بھی کہیں رسی بنائی جاسکتی ہے۔ یہ سوچ کر لوگ اور بھی فکرمند ہوگئے۔

گھر میں چھپی بیٹھی گینسو کے کی ماں یہ سب سن رہی تھی۔ اس نے گینسو کے کو بلا کر کہا ''رسی کو نمکین پانی میں بھگو کر سکھا لو، پھر اسے لوہے کی پلیٹ پر رکھ کر آگ میں تپاؤ، بس کچھ ہی دیر میں راکھ کی رسی بن کر تیار ہوجائے گی۔''

گینسو کے نے ویسا ہی کیا۔ ماں کے بتائے ہوئے طریقے سے واقعی راکھ کی رسی تیار ہوگئی۔ گینسو کے خوشی کے مارے اچھل پڑا اور یہ بات سارے گاؤں والوں کو بتادی۔ یہ خبر سن کر راجہ نے اسے دربار میں بلایا۔ راکھ کی رسی دیکھ کر وہ حیرت میں پڑ گیا، اور پھر بولا ''ابھی تو ایک اور شرط باقی ہے۔''

''وہ کیا ہے؟'' سب نے ایک ساتھ کہا۔

راجہ نے کچھ دور ایک ساتھ کھڑے ایک جیسی شکل کے دو گھوڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''ان دو گھوڑوں کو تم دیکھ رہے ہو! جاؤ انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ اور پہچان کر بتاؤ کہ ان میں ماں کون ہے اور اس کا بچہ کون ہے۔ یہ ہماری دوسری شرط ہے۔''

گاؤں والے دونوں گھوڑے لے کر گاؤں چلے آئے اور چاروں طرف سے گھیر کر آگے پیچھے دائیں بائیں اچھی طرح سے دیکھا مگر وہ لوگ یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ان میں ماں کون ہے اور بچہ کون ہے۔ پھر یہ بات گینسو کے کی ماں تک پہنچی۔ تب اس کی ماں نے کہا: ''اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ ایسا کرو کہ دونوں گھوڑوں کو آمنے سامنے کھڑا

کر کے ان کے بیچ کچھ گاجر رکھ دو جو بھی گھوڑا گاجر کو چھین جھپٹ کر کھائے گا وہ بچہ ہوگا۔ کیونکہ جب تک بچہ پورا کھا نہیں لے گا ماں خاموش اس کی رکھوالی کرتی رہے گی۔ چاہے جانور ہو یا انسان ماں کی ممتا سب میں برابر ہوتی ہے۔" گینسو کے نے ایسا ہی کیا اور پتہ لگا لیا کہ مان کون تھی اور اس کا بچہ کون سا تھا۔ اس طرح راجہ کی دوسری شرط بھی پوری ہوگئی۔

یہ دیکھ کر راجہ نے اس کی عقل مندی کی بہت تعریف کی، لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے ان لوگوں کو ایک پتھر کی گیند دیتے ہوئے کہا کہ "اس گیند میں ٹیڑھے میڑھے سوراخ ہیں۔ جاؤ ان میں دھاگے پرو کر لاؤ۔"

سب لوگ اس ٹیڑھے میڑھے چھید والی گیند کو لے کر گاؤں واپس آ گئے۔ لیکن کافی کوشش کے بعد بھی وہ لوگ سوراخوں سے دھاگے کو آر پار کر نہ سکے۔ ہر بار دھاگا کہیں نہ کہیں پر جا کر اٹک جاتا جس سے لوگ مایوس ہو جاتے۔ تب گینسو کے نے ایک بار پھر ماں کے پاس جا کر اس مسئلے کا حل بتانے کو کہا۔ ماں نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

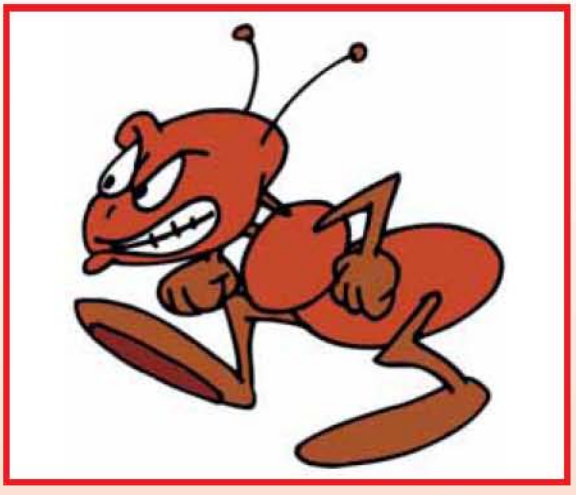

"ایسا کرو گیند کے ایک سرے پر شہد لگا دو اور دوسرے پر چیونٹی کے پیٹ میں دھاگا باندھ کر سوراخ میں چھوڑ دو۔ چیونٹی سوراخ سے

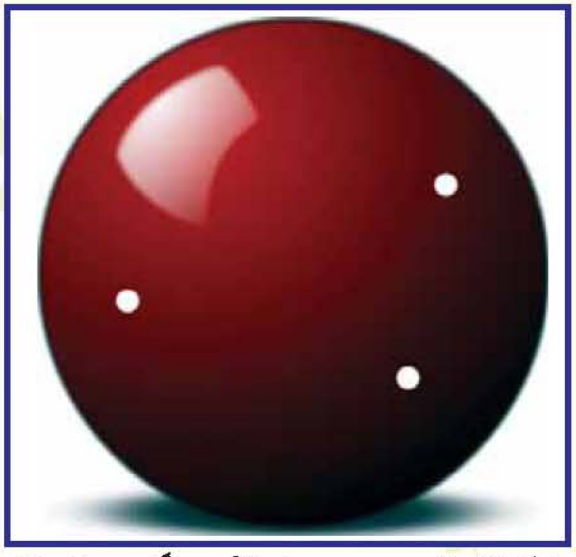

شہد کی خوشبو پا کر دوسرے سرے تک پہنچ جائے گی اور دھاگا لے کر سوراخ سے پار ہو جائی گی۔"

گینسو کے نے ایسا ہی کیا اور راجہ کی تیسری شرط بھی پوری ہوگئی۔ راجہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور کہنے لگا "مجھے لگتا ہے کہ تم نے یہ سب کسی اور سے سیکھا اور سمجھا ہے۔"

گینسو کے نے جواب دیا "ہاں مہاراج آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، راکھ کی رسی، گھوڑے کی پہچان اور گیند کے ٹیڑھے میڑھے سوراخ میں دھاگا پرونا یہ سب ہمارے بزرگوں نے سکھایا ہے۔ وہ اپنے جسم سے کمزور ضرور ہو جاتے ہیں، مگر ان کے پاس زندگی بھر کے اچھے برے تجربوں کا بہت بڑا خزانہ بھرا رہتا ہے۔ اس لیے بزرگ ہمیشہ کام آتے ہیں اور ان کے وجود کو بے کار یا ایک طرح کا بوجھ سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔"

یہ سنتے ہی راجہ کو اپنی غلطی کا پورا احساس ہو گیا اور اپنے حکم کو واپس لیتے ہوئے اس نے کہا "جاؤ! تم لوگ اپنے اپنے ماں باپ کو عزت کے ساتھ گھر واپس لے آؤ۔"

سبھی لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سب اپنے اپنے ماں باپ کو گھر واپس لا کر ہنسی خوشی رہنے لگے۔ □

Sultan Ahmed Ashk Ghagha Ghat, Khan Mirza opp. Hanuman Mandir Mahender Sultan Ganj, Patna-800006

□ رونق جمال

اللہ اور بھگوان

سیکڑوں سال پہلے کی بات ہے کہ ایک گاؤں میں ایک مولوی صاحب اور ایک پنڈت جی رہتے تھے۔

دونوں میں گہری دوستی تھی اور دونوں اپنے گاؤں کے علاوہ آس پاس کے گاؤں قصبوں میں بھی بہت مشہور تھے۔

مسلمان مولوی صاحب کو عید بقرعید کے علاوہ موت مٹی فاتحہ درود کے لیے بھی بلاتے تھے۔ اسی طرح پنڈت جی کو ہندو تہواروں کے علاوہ موت کریا کرم پوجا پاٹ کے لیے یاد کیا کرتے تھے۔ دونوں کے گھروں کا خرچہ فاتحہ درود اور پوجا پاٹ سے ہی چل جاتا تھا۔ دونوں کی اپنے اپنے سماج میں کافی قدر و عزت تھی۔ دونوں کو اپنے اپنے سماج سے کافی نذرانہ اور دان مل جاتا تھا۔

انفاق سے ایک سال ملک میں سوکھا پڑ گیا۔ سوکھے سے قحط پھیل گیا اور قحط سے انسان تو انسان جانور بھی پریشان ہو گئے۔ بھوک پیاس سے گاؤں اور گاؤں کے آس پاس کے علاقوں میں بھی جانور دم توڑ رہے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ قحط سے انسان بھی بھک مری کا شکار ہونے لگے۔ خاص طور پر بوڑھے اور بچے۔ جن غریبوں کے پاس کھانے کو اناج نہیں تھا وہ بھی بھوک سے مر رہے تھے۔ اس علاقے کا راجہ کسی نہ کسی طرح اپنی رعایا کو اناج مہیا کرانے کی کوشش کر رہا تھا مگر نہ بارش ہوئی نہ سوکھا مٹا نہ قحط کا زور کم ہوا۔ ان برے حالات کی وجہ سے کی وجہ سے عید بقرعید اور ہولی دیوالی کے تہوار بھی پھیکے پڑ گئے جس سے مولوی صاحب اور پنڈت جی

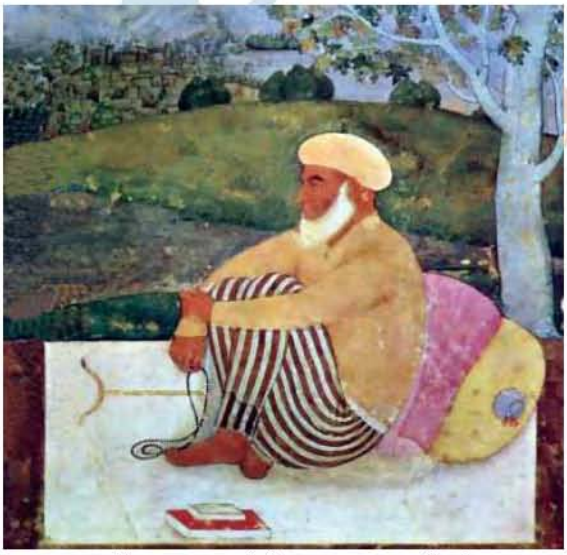

کی پوچھ کم ہوگئی تھی۔ دونوں کی جو پونجی تھی وہ ختم ہوچکی تھی اور ان کے بچے بھی بھوک پیاس سے متاثر ہونے لگے تھے۔

ایک دن مولوی صاحب نے خدا کے حضور دو رکعت نماز ادا کی اور اپنے لیے، اپنے کنبے کے لیے خوب دعا کی اور حالات سے تنگ آ کر اللہ کے سامنے خودکشی کا ارادہ ظاہر کردیا۔ خودکشی کے ارادے سے وہ یہ سوچ کر جنگل کی طرف نکل گئے کہ گھنے جنگل میں داخل ہوجاتا ہوں جہاں بھوکے جنگلی جانور مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اس طرح بھوک پیاس اور ذلت سے نجات مل جائے گی اور بھوکے جانور بھی مجھے کھالینے کے بعد تھوڑے دنوں کے لیے بھوک سے نجات پا جائیں گے۔

مولوی صاحب اس ارادے سے جیسے ہی جنگل میں داخل ہوئے ایک شیر دھاڑتا ہوا ان کے سامنے آ گیا۔ مولوی صاحب آگے بڑھے اور آنکھیں موند کر شیر کے سامنے جا کر کھڑے ہوگئے۔ لیکن چند لمحے گذر جانے کے بعد بھی جب شیر نے مولوی صاحب پر حملہ نہیں کیا تو مولوی صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ مولوی صاحب نے دیکھا شیر

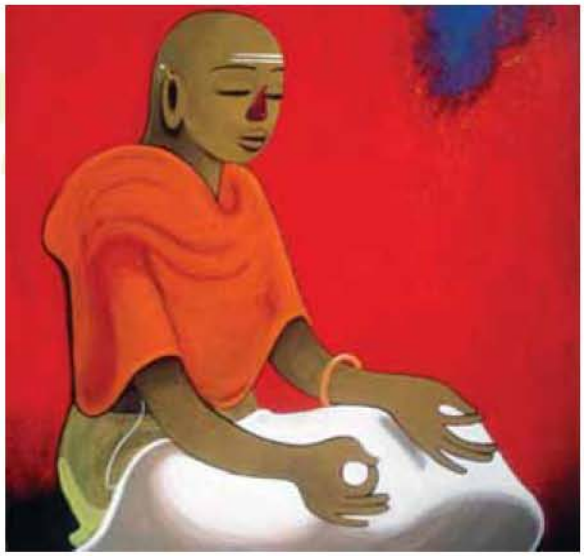

زمین پر بیٹھا کانپ رہا ہے اور انھیں حیرت سے دیکھ رہا ہے، مولوی صاحب نے شیر کو خاموش دیکھ کر کہا:

''میاں شیر! میں جانتا ہوں تم بہت بھوکے ہو، بھوک سے تمہارا برا حال ہے، آؤ مجھے مار ڈالو۔ خود بھی کھاؤ اور اپنے ساتھیوں کو بلا کر انھیں بھی کھلاؤ تاکہ تم اور تمہارے ساتھی میری لاش سے بھوک مٹا کر چند دن اور زندہ رہ سکیں۔''

''میں تمہیں نہیں کھا سکتا؟'' شیر نے کہا۔

''کیوں نہیں کھا سکتے؟''

''اللہ کا حکم ہے اس لیے۔'' شیر نے جواب دیا۔

''اللہ کا حکم ہے اس لیے؟ یہ کیسا حکم ہے بھئی؟ مجھے تو بتاؤ۔''

''اللہ نے آپ کی دعا قبول کرلی ہے اور مجھے آپ کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔ میرے گلے میں جو تھیلی لٹک رہی ہے اسے میرے گلے سے لے لو۔ اس میں اشرفیاں ہیں اور ان اشرفیوں سے تم اپنے خاندان کے لیے ڈھیر سارا اناج کپڑے اور مٹھائیاں خرید سکتے ہو۔''

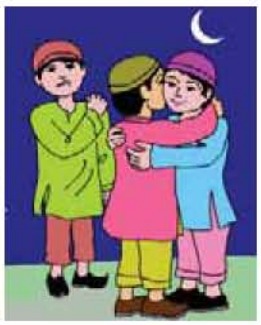

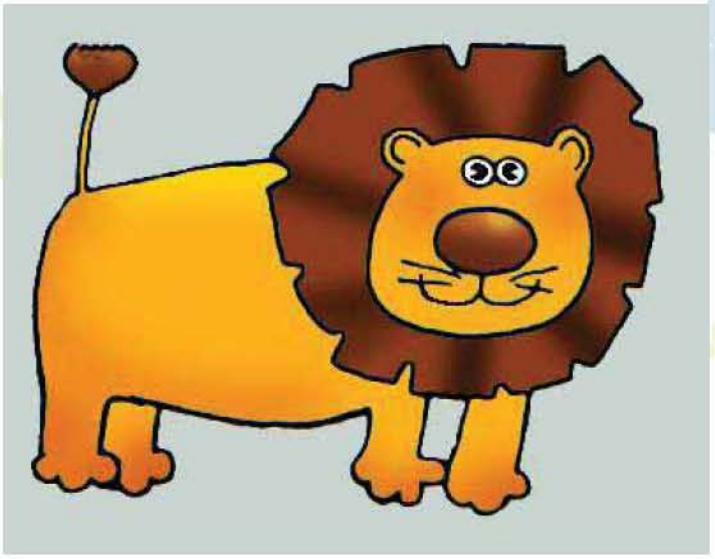

مولوی صاحب نے آگے بڑھ کر دیکھا واقعی شیر کے گلے میں ایک تھیلی جھول رہی تھی۔ مولوی صاحب نے شیر کے گلے سے وہ تھیلی نکال کر دیکھا اس میں بہت سی اشرفیاں تھیں۔

مولوی صاحب خدا کے اس احسان پر فوراً سجدے میں گر گئے اور اشرفیاں لے کر بازار جا پہنچے۔ وہاں سے ڈھیر سارا اناج، سبزی، مٹھائیاں خرید کر گھر وہ لوٹے اور آدھی اشرفیاں پاس پڑوس کے لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ یہ خبر پنڈت جی کو ملی تو وہ مولوی صاحب کے گھر پہنچے اور اشرفیاں تقسیم کرنے والی خبر کی تصدیق کرنے لگے۔ مولوی صاحب نے ساری کہانی پنڈت جی کو سنا دی۔ مولوی صاحب کی کہانی سن کر پنڈت جی کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا اور سوچنے لگے کہ کاش میرے بھگوان نے بھی میرا خیال رکھا ہوتا۔

یہ سوچتے ہوئے پنڈت جی گھر آئے چندگھی کے دیے جلائے اور

بھگوان کی خوب پوجا پاٹ کرنے کے بعد خودکشی کا جھوٹ موٹ کا ارادہ کر کے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی پنڈت جی کے سامنے ایک بھوکا لاغر شیر آ گیا۔ پنڈت جی اسے اشرفیاں دینے والا شیر سمجھ کر لالچ میں شیر کے سامنے پہنچ گئے اور بولے۔

''لاؤ شیر جی! مجھے وہ اشرفیاں دے دو جو میرے بھگوان نے میرے لیے بھیجی ہے۔''

پنڈت جی کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر شیر کو خطرہ محسوس ہوا اور اس نے دہاڑ مارتے ہوئے پنڈت جی پر حملہ کر دیا۔ پنڈت جی زخمی ہو گئے اور کسی طرح بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ نکلے۔ جنگل سے بھاگ کر وہ مولوی صاحب کے پاس پہنچے اور ساری کہانی کہہ سنائی۔

پوری بات سن کر مولوی صاحب مسکرانے لگے۔

مولوی صاحب کو مسکراتا دیکھ کر پنڈت جی بولے ''میں موت کے منہ سے لوٹ کر آیا ہوں اور تم مسکرا رہے ہو۔''

''پنڈت جی! میں تمہاری نادانی اور بے وقوفی اور لالچ کو جان کر اور سمجھ کر مسکرا رہا ہوں۔ پنڈت جی میں سچے دل سے مرنے گیا تھا اس لیے اللہ نے مجھے انعام میں زندگی اور اشرفیاں دونوں دے دیں۔ تم لالچ میں بُری نیت سے اشرفیوں کے چکر میں گئے تھے اور اس لیے شیر نے تم پر حملہ کر دیا۔ آؤ بیٹھو میں تمہارے زخموں پر مرہم لگائے دیتا ہوں۔''

پنڈت جی شرمندہ تھے اور نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب نے بچی ہوئی بہت سی اشرفیاں پنڈت جی کو دے دیں اور کہا:

''لو بھائی۔ چاہے اللہ کہہ لو یا بھگوان۔ وہ ہمیشہ نیتوں پر فیصلہ کرتے ہیں۔''

پنڈت جی نے اشرفیاں لیتے ہوئے مولوی صاحب کو گلے لگا لیا اور رو پڑے۔ ان کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔ □

□ جلیل اشرف

ہانڈی میں طوفان

بہت دنوں کی بات ہے۔

کسی ملک میں ایک راج کمار تھا اور ایک راج کماری تھی۔ بہت ہی خوبصورت۔ دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ چار سو ہاتھی، پانچ سو گھوڑے اور دو سو اونٹ بارات میں تھے۔ چھ ہزار آدمی باراتی تھے۔ بارات طرح طرح کے فانوس اور شاہی دروازوں سے سجائی گئی تھی۔ شادی کے بعد بھی نت نئی تقریبیں ہوتی رہیں اور دونوں راجہ اور رانی بن گئے۔

راج کمار اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا محل سونے کا تھا۔ سورج کی کرنوں سے یہ محل خوب چمکتا تھا۔ لیکن سورج کی گرمی سے یہ پتا نہیں تھا۔ محل میں ایسے ایسے انمول پتھر لگے ہوئے تھے جو گرمی میں ٹھنڈک پہنچاتے اور جاڑے میں گرمی۔ اس کی کاریگری بے مثال تھی۔ محل کیا تھا جنت کا نمونہ تھا۔ لیکن جب شادی کو آٹھ سال ہو گئے اور راجہ کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تو اس کو اپنا سونے کا محل جیسے کاٹ کھانے لگا۔ اس کی چمک پھیکی پڑ گئی۔ بڑے بڑے نجومی آئے، دعا تعویذ خیر خیرات سب کچھ ہوئے پھر بھی مراد بر نہ آئی۔ راجہ ناامید ہو گیا۔ وزیر اور درباریوں نے مل کر راجہ سے دوسری شادی کرنے کے لیے کہا اور بہت اصرار کے بعد راجہ نے مجبوراً اور محض اولاد کی تمنا میں دوسری شادی کر لی۔ نئی رانی گھر آئی تو پہلی رانی کا آرام و سکون چمن گیا۔ امن و سکون دینے والا محل سازشوں کا اڈہ بن گیا۔

ایک دن راجہ نے نئی رانی کے بہکاوے میں پہلی رانی کو محل سے نکال دیا۔ پہلی رانی پر بجلی سی گر پڑی۔ وہ شرم اور غیرت کے مارے ایک گھنے جنگل میں چلی گئی۔ چلتے چلتے جنگل کے بیچ میں پہنچ گئی جہاں انسان کا نام

ونشان نہ تھا۔ البتہ جنگلی جانور اچھلتے کودتے دکھائی دیے۔ وہ بہت تھک گئی تھی، ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ سامنے ایک پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ ندی میں اتری اور چلو سے پانی پیا، تب اسے سکون ملا۔

آگے اتنا گھنا جنگل تھا کہ اور آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کہیں قریب ہی سے شیر کے دہاڑنے کی آواز آرہی تھی۔ رانی لرز اٹھی اور خوف سے رونے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ شیر پھر گرجا۔ دو دن کی بھوکی رانی سوچنے لگی "یہ شیر مجھ کو کھا ہی جائے تو اچھا ہے۔"

اس نے سوچا اٹھ کر شیر کی طرف چلوں، تبھی ایک آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا "اپنی حفاظت کرو، تمہارے پیٹ میں بچہ ہے، پورے دو ماہ کا۔ تم مر گئیں تو وہ بھی مر جائے گا۔" رانی چاروں طرف دیکھنے لگی لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ وہ ان الفاظ کو یاد کر کے خوشی سے پاگل ہو اٹھی، لیکن اپنی حالت پر اس کا دل بھر آیا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔

جنگل کی دیوی ایک بڑھیا کے روپ میں ندی سے پانی لینے آئی تھی۔ روتی ہوئی رانی کو دیکھ کر وہ پاس آئی۔ سب باتیں معلوم ہونے پر اسے رانی کے اوپر ترس آ گیا اور وہ رانی کو اپنی کٹیا میں لے گئی۔ کھانے کے لیے اس کے سامنے جنگلی پھل پھول کا ڈھیر لگا دیا۔

رانی کے دن بیتنے لگے۔ بڑھیا اسے ہر طرح سے آرام پہنچاتی، کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے دیتی۔ رانی کو وہاں ایسے میٹھے پھل ملتے جو بہت ہی مزے دار ہوتے، عمدہ مٹھائیوں سے بھی مزے دار۔

رانی کو لڑکا پیدا ہوا۔ پھول کی طرح نازک اور چاند کی طرح خوبصورت۔ کوئل کوک اٹھی، پپیہے پی پی کرنے لگے۔ روز مولسری کے سائے میں ہزاروں سفید پھول بچے پر خود کو نچھاور کر دیتے۔ ننھا سا بچہ جنگل میں ہنستا، مسکراتا، ادھر ادھر بھاگتا پھرتا۔ رانی دیکھ دیکھ کر نہال ہو جاتی۔ بڑھیا بھی پھولی نہ سماتی۔ بچے کی عمر کے ساتھ ساتھ رانی

کو دوبارہ محل میں پہنچنے کی امید بھی بڑھنے لگی۔ سمندر کی لہروں کی طرح، کیونکہ آج سمندر کی گود میں پونم کا چاند تھا۔

لیکن ان ہی دنوں رانی کے ساتھ ایک بہت افسوس ناک حادثہ ہوگیا۔ رانی ندی سے پانی لانے گئی تھی تو ایک چڑیل نے اسے اکیلی پاکر اس کی ایک آنکھ نکال لی۔ رانی بے چاری رودھوکر رہ گئی۔

لڑکا آہستہ آہستہ سمجھ دار ہونے لگا۔ ایک دن اس نے رانی سے پوچھا ''ماں میرے پتا جی کہاں ہیں؟'' رانی کی آنکھیں بھر آئیں۔ بولی ''بیٹا! تمہارے پتا جی کبھی ملیں گے اگر خدا نے چاہا'' اور وہ آنچل کے کونے سے آنسو پونچھتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ راج کمار کچھ نہ سمجھ سکا۔

ایک دن اس بوڑھی عورت اور رانی میں اناج کے بارے میں باتیں ہورہی تھیں اور رانی چاول کی تعریف کررہی تھی۔

راج کمار نے پوچھا ''یہ چاول کیا ہوتا ہے ماں؟''

رانی نے بہت تفصیل کے ساتھ اسے چاول کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہا کہ چاول سے کھیر، پلاؤ اور دوسری بہت سی مزے دار چیزیں پکتی ہیں۔ راج کمار مچل اٹھا ''پھر تو میں بھی چاول کھاؤں گا۔''

رانی بولی ''مگر یہاں اس جنگل میں چاول کہاں سے مل سکتا ہے؟''

بڑھیا نے کہا ''چاول تو یہاں بھی مل سکتا ہے لیکن اس کے لیے محنت کی ضرورت ہے، یہاں تو دھان اچھی طرح بویا اور کاٹا جا سکتا ہے۔ مگر یہاں اس کے پودے نہیں ملتے۔''

''میں محنت سے نہیں ڈرتا۔ بتاؤ کیا کرنا ہوگا؟ جلدی کہو میں چاول ضرور اگاؤں گا، کھاؤں گا اور تم لوگوں کو بھی کھلاؤں گا۔''

بڑھیا نے کہا ''یہاں سے بہت دور لال سمندر کے ٹاپو میں ڈائنوں کا دیس ہے۔ وہاں صرف ڈائنیں رہا کرتی ہیں۔ انسان کی بو پاتے ہی انہیں کھا جاتی ہیں۔ انسان وہاں پہنچ نہیں سکتا۔ وہاں دھان کے کھیت ہیں۔ جن میں طرح طرح کے دھان بوئے اور کاٹے جاتے ہیں۔ کھیت کے چاروں طرف ڈائنوں کا بڑا پہرہ رہتا ہے، کوئی بھی دانا نہیں چھو سکتا۔ تم کیسے لاسکتے ہو؟ ڈائنوں کے دیس میں تمہیں کیسے بھیج سکتی ہوں، وہاں جاکر تم کیسے بچ سکتے ہو؟''

لیکن راج کمار نہیں مانا وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ وہ دھان لانے کو تیار ہوگیا۔ مجبوراً رانی کو اجازت دینی پڑی۔ راج کمار نے کہا ''گھبرانا نہیں، میں دھان لاؤں گا، ڈائنوں سے لڑوں گا اور انہیں ماروں گا۔''

بڑھیا نے کہا ''ایک ترکیب بتاتی ہوں بیٹا، اسی سے کام لینا۔ جب ڈائنوں کے دیس میں پہنچنا تب نہاکر پانچ پھول زمین میں گاڑ دینا اور لال گولی منہ میں رکھ لینا۔ گولی منہ میں رکھتے ہی تم جو چاہو گے بن جاؤ گے۔ تم کوئی پرندہ بن کر اُڑ جانا اور کھیت پر چکر لگاتے رہنا۔ وقت ملتے ہی دھان کی اچھی سی بالی دیکھ کر لے اڑ آنا۔ ڈائنیں پیچھے دوڑیں گی۔ لیکن تم اڑتے رہنا، پیچھے پلٹ کر مت دیکھنا۔ کچھ دور آنے کے بعد وہ خود ہی لوٹ جائیں گی۔'' یہ کہہ کر بڑھیا نے اسے پانچ لال پھول اور ایک لال گولی دی، اور راج کمار ماں اور بڑھیا کی دعائیں لے کر چل پڑا۔

سمندر پار پہنچ کر اس نے پانچ لال پھول زمین میں گاڑ دیے اور گولی منہ میں رکھ لی اور ایک طوطا بن گیا۔ اڑ کر دھان کے کھیت میں پہنچا اور وہاں چکر لگانے لگا اور موقع ملتے ہی ایک بڑی بالی توڑ کر اڑ گیا۔ ''مارو... پکڑو...'' چلاتی ہوئی بہت سی ڈائنیں پیچھے دوڑیں۔ لیکن طوطا اڑتا

ہی چلا گیا۔ پیچھے کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ڈائنیں تھک کر لوٹ گئیں۔

دھان لے کر راج کمار ماں کے پاس پہنچا۔ ماں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بڑھیا بھی خوش ہوئی اور ندی کے کنارے دھان بو دیا گیا۔

بڑھیا کے پاس ایک چھوٹی سی گائے بھی تھی۔ جس نے اِدھر کئی مہینوں سے دودھ دینا بند کر دیا تھا۔ چنانچہ راج کمار کو بھی عرصے سے دودھ نہیں ملا تھا۔ لیکن ایک دن اسے دودھ پینے کی خواہش ہوئی۔ اس نے بڑھیا سے پوچھا ''کیا تم بتلا سکتی ہو کہ ایسی گائے کہاں ملے گی جو بچہ جنے بغیر بارہ مہینے دودھ دیتی رہے؟''

بڑھیا نے کہا ''تمہاری ہمت اور حوصلہ دیکھ کر ہمیں یقین ہے کہ تم اس مہم میں بھی ضرور کامیاب ہو گے۔ پہلے سمندر کے اس پار چڑیلوں کا جو دیس ہے وہاں بہت گائیں رہتی ہیں اور ہمیشہ دودھ دیتی رہتی ہیں۔ جاؤ وہیں سے خوبصورت گائے لے آؤ، اور اس بار مچھر بن کر جانا۔''

راج کمار نے سمندر کے کنارے پہنچ کر لال پھول زمین میں گاڑے اور لال گولی منہ میں رکھ کر مچھر بننے کی خواہش کی اور دیکھا کہ گائیوں کا جھنڈ چر رہا ہے۔ راج کمار مچھر بن کر اڑتا رہا۔ ایک خوبصورت گائے دیکھ کر اس کے کان میں گھسا۔ گائے بھڑک کر بھاگی، بھاگتے بھاگتی سمندر کے کنارے آئی، چڑیلیں پیچھے پیچھے دوڑیں اور تھک کر لوٹ گئیں۔ گائے کے ساتھ راج کمار بہ خیریت ماں کے پاس پہنچا۔ رانی اور بڑھیا راج کمار کو دیکھ نہال ہو گئیں۔

ایک دن بات چیت کے دوران راج کمار کو معلوم ہوا کہ اس کی ماں کی ایک آنکھ کوئی چڑیل نکال لے گئی ہے۔ ماں سے پوچھا تو اس نے کہا ''میں ایک صبح سویرے ندی سے پانی لانے جا رہی تھی کہ پورب کی طرف سے ہوا میں آندھی کی آواز سنائی پڑی۔ کچھ دیر کے بعد آواز بالکل نزدیک آ گئی۔ دیکھا ایک بہت بڑا درخت ہوا میں اڑ رہا ہے۔ اس پر ایک چڑیل بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے درخت زمین پر اتارا اور کہا 'تم بہت خوبصورت ہو، میرے ساتھ چلو، میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی اور اپنے ساتھ رکھوں گی۔ یہاں جنگل میں کیوں پڑی ہو؟' اس کے بہت ضد کرنے پر بھی جب میں تیار نہ ہوئی تو چڑیل کو غصہ آ گیا اور تب وہ میری ایک آنکھ نکال کر لے گئی۔''

راج کمار کو بہت دکھ ہوا۔ اسی وقت اس نے عہد کیا ''جب تک میں اپنی ماں کی آنکھ نہ لوٹا دوں گا، اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔''

بڑھیا نے کہا ''یہ بہت مشکل کام ہے بیٹا! چڑیلوں کے دیس جا کر آنکھ لے آنا لگ بھگ ناممکن ہے۔ وہ چڑیلوں کی رانی ہے۔ اس تک انسان کا پہنچنا بہت مشکل ہے۔''

راج کمار کے بضد ہو جانے پر بڑھیا اور ماں نے کہا ''جاؤ خدا تمہارا نگہبان ہے لیکن ہوشیار رہنا۔''

راج کمار چلا، راستے میں اس نے تھوڑے سے چنے ساتھ لے لیے۔ چڑیلوں کی نانی کے پاس پہنچ کر اس نے پاؤں چھوئے اور کہا ''کہو نانی! حال اچھا ہے نا؟ ماں نے کہا تھا کہ جاؤ نانی کے گھر ہو آؤ۔ نانی کے یہاں نہ جانے پر اگلے جنم میں گدھے کے روپ میں جنم لینا

پڑے گا۔ اس لیے تمہارے پاؤں چھونے اور آشیرواد لینے چلا آیا۔"

بڑھیا نے یہ آزمانے کے لیے کہ راج کمار واقعی چڑیلوں کے خاندان سے ہے اسے لوہے کے چنے کھانے کو دیے۔ آنکھ بچا کر راج کمار نے لوہے کے چنے جیب میں رکھ لیے اور

دوسری جیب سے چنے نکال کر چبانے لگا۔ چنا توڑنے کی آواز سن کر چڑیل نے سمجھا ہمارا اصلی ناتی یہی ہے اور تب چڑیل بہت ہی شفقت سے پیش آنے لگی۔ راج کمار کچھ دن وہیں رہا۔

ایک دن راج کمار نے کہا "نانی یہ اوپر کیا لٹک رہا ہے؟ اس میں کیا رکھا ہے؟"

"کیا کرو گے جان کر؟"

ناتی کے ضد کرنے پر نانی نے بتایا "پہلی ہانڈی میں آندھی بھری ہوئی ہے۔ اسے کھول دینے سے بہت زوروں کی آندھی اٹھ جائے گی۔ دوسری میں آگ ہے۔ اسے کھولنے سے سب کچھ جل کر راکھ ہوجائے گا۔ تیسری ہانڈی میں پانی ہے۔ اسے کھولنے سے بہت زوروں کی بارش شروع ہوجائے گی۔ سب کچھ ڈوب جائے گا۔"

راج کمار نے پوچھا "نانی چھوٹی ہانڈی میں کیا ہے؟"

چڑیل خاموش رہی، لیکن ناتی کے بار بار اصرار پر اس نے کہا "ایک رانی کی آنکھ۔"

راج کمار دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور دریافت کیا "یہ آنکھ پھر لگ سکتی ہے؟"

"لگ کیوں نہیں سکتی، ترکیب سے لگ جائے گی۔"

"کیا ترکیب ہے نانی؟"

"کیا کرو گے تم جان کر۔"

"نانی بتاؤ نا۔"

"نہیں بیٹے تم..."

"میری اچھی نانی بتاؤ نا۔"

اور ناتی کی ضد کے آگے نانی کو جھکنا پڑا۔ اس نے کہا "جو گائے بغیر بچے دیے بارہ ماس دودھ دیتی ہو اس کا دودھ خالی آنکھ میں لگا کر اوپر سے آنکھ رکھ کر باندھ دو۔ ساتھ ہی فوراً بوئے اور کاٹے جانے والے چاول کا کھانا بنا کر کھلا دو۔ اس کے تھوڑی دیر بعد پٹ کھول دینے پر آنکھ پہلے کی طرح کام کرنے لگے گی۔ اچھا بیٹا! جا اب جا کر سو جا میں بھی سوتی ہوں۔ آج گرمی اپنے شباب پر ہے دھوپ بہت تیز ہے۔ لو کی لہریں چل رہی ہے۔ اس لیے کہیں باہر نہ جانا۔ شام کو گھومنے پھرنے چلے جانا سمجھے نا؟"

چڑیل سوگئی۔ راج کمار بھی اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور جب راج کمار نے دیکھا کہ چڑیل بے خبر سو رہی ہے تو چپکے سے اٹھا۔ اس نے سب ہانڈیاں آہستہ آہستہ اتاریں اور آنکھ والی ہانڈی سے آنکھ نکال کر جیب میں رکھ لی اور باقی ہانڈیاں بھی ساتھ لے لیں۔

ادھر چڑیل کی جب آنکھ کھولی تب اس نے دیکھا راج کمار چارپائی پر نہیں ہے۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر تلاش کیا لیکن راج کمار کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کی نظریں اوپر کی طرف اٹھ گئیں تو دیکھا ہانڈیاں بھی غائب ہیں۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اور گھبرا کر دوڑ پڑی اور چلا چلا کر آواز دینے لگی، "پکڑو پکڑو... مارو مارو... کھاؤ کھاؤ..." اس کی آواز سے آسمان گونج اٹھا۔

راج کمار اپنی پوری طاقت سے بھاگا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ہزاروں چڑیلیں اس کے پیچھے دوڑی چلی آرہی ہیں۔ اور قریب تھا کہ راج کمار پکڑا جاتا کہ اس نے بہت ہوشیاری سے آندھی والی ہانڈی

کھول دی جس سے خوفناک طوفان اٹھا اور آسمان گردوغبار سے بھر گیا اور چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی چڑیلیں اسی تیزی سے راج کمار کا پیچھا کرتی رہیں۔

تب راج کمار نے مجبوراً آگ والی ہانڈی کھول دی۔ اسے کھولتے ہی آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے اور چڑیلیں اس میں جل کر راکھ ہوگئیں۔ اب راج کمار نے پانی والی ہانڈی کھولی جس سے زوروں کی بارش شروع ہوگئی۔ کچھ دیر میں وہاں کی ایک ایک چیز پانی میں ڈوب گئی۔

راج کمار ماں کی آنکھ لے کر سیدھا گھر آیا۔ ماں اپنے بیٹے کی ہمت اور بہادری دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اسے محسوس ہوا کہ صرف آنکھ ہی نہیں بلکہ اسے سب کچھ مل گیا۔ بڑھیا بھی بہت خوش تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ آج اس کا بھی فرض پورا ہوگیا۔

ادھر راجہ کے یہاں دوسری رانی سے اب تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اب راجہ کو دوہری فکر تھی۔ ہر وقت سوچ اور غم میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے راجہ وقت سے پہلے بوڑھا ہوگیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لیتا تھا جس سے ملک میں بدامنی پھیل رہی تھی۔ وزیر اور درباری راجہ کی یہ حالت دیکھ کر پریشان تھے۔ ایک دن وزیر کو کسی طرح یہ بات معلوم ہوئی کہ پہلی رانی صاحبہ زندہ ہیں اور ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جو اَب جوان ہوچکا ہے۔ وزیر نے تحقیق کرنے کے بعد راجہ تک یہ خبر پہنچادی۔

راجہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو وزیر اور اپنے لشکر کے ساتھ جنگل میں گیا اور رانی سے اپنی غلطی کی معافی مانگی اور اپنے ساتھ گھر چلنے کے لئے التجا کی۔

بڑھیا نے کہا ”جاؤ بیٹی! آج تمہارے پاس خود مہاراج چل کر آئے ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ ان کی خطا معاف کردو اور ان کی التجا قبول کرلو۔“

سولہ کہاروں کی سنہری پالکی میں بیٹھ کر رانی، بڑھیا اور راج کمار محل میں آئے۔ راجہ نے رانی اور راج کمار کے پانے کی خوشی میں ملک بھر میں جشن منانے کا اعلان کردیا۔ دل کھول کر غریبوں کو کھانا کھلایا اور کپڑے بانٹے اور آخری دن راجہ نے راج کمار کو ہیرے جواہرات جڑت تخت وتاج پر بٹھادیا اور ملک کی باگ دوڑ اور راج پاٹ راج کمار کو سونپ دیا۔

رانی نے بڑھیا سے کہا ”ماں یہ سب کچھ آپ کی بدولت ہوا ہے لہٰذا آج سے آپ ہماری سرپرست ہیں...“

یہ کہہ کر اس نے گھر کی چابی بڑھیا ماں کے حوالے کردی۔ □

Dr Jalil Ashraf 'UFUQ' Azad Nagar,Pelawal Road, Hazribagh-825335

نظم

□ اشفاق الرحمٰن مظہر

رشتہ مٹی کا

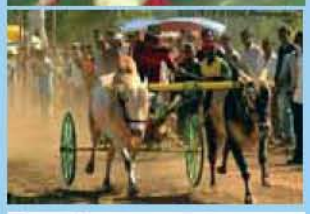

بچوں کی آنکھوں میں ہے اک خواب سنہرا مٹی کا
مل جل کر پھر سب نے بنایا ایک گھروندا مٹی کا

گڑیا کی شادی کا ساماں طاق پہ اب بھی رکھا ہے
پیتل کے چھوٹے برتن ہیں، ایک ہے چولہا مٹی کا

پیڑوں کی چھایا میں جھولا، بوجھ ہمارا سہتا تھا
آنگن میں تھا ایک کنواں بھی گھر میں مٹکا مٹی کا

ساون آتے ہی مٹی سے سوندھی خوشبو اٹھتی تھی
کیچڑ میں لت پت لگتا تھا گیلا کرتا مٹی کا

بیلوں کی گاڑی میں ہم سب میلے جایا کرتے تھے
ہلتے جلتے کٹ جاتا تھا کچا رستا مٹی کا

گیس کا چولہا، مکسی، کولر فرج نہیں تو کیا جینا
کیسے کاٹا تھا پرکھوں نے ایک زمانہ مٹی کا

شام ڈھلے جب بھٹے کھائیں یاد آتی ہے کھیتوں کی
شہر میں رہ کر بھول نہ پائے اپنا رشتہ مٹی کا

K M Ahfaqur Rahman 21/12, Subhash Street 1st Floor Barracks Road Periamet Chennai-600003 TN

□ایم اے دی بوس

لطیفے ہنسی اور اردو

بات کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہی کوئی اس وقت کی جب ہم درجہ سات یا آٹھ میں ہوا کرتے تھے۔ وہ اردو ادب کی ایک کلاس تھی۔ ٹیچر کلاس میں آچکی تھیں۔ اس دن کا سبجکٹ تھی پطرس بخاری کی ایک مزاحیہ تحریر، جو کہ سبق میں بھی شامل تھی۔ میری اردو اچھی ہونے کی وجہ سے ٹیچر نے مجھے ہی ریڈنگ کے لیے بلالیا۔ یوں تو اچھی اردو کی وجہ سے مجھے اور بھی کافی فائدے تھے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی میں نے اردو کی کاپی بنائی بھی ہو۔ اور ٹیچر بھی ہماری ہمیشہ درگزر سے ہی کام لیتیں۔ خیر سبق تو کافی دلچسپ تھا، اس کا ہر ایک اقتباس کافی مزاحیہ اور ہنسنے پر مجبور کرنے والا تھا، اور کچھ مابدولت کے پڑھنے کا بھی کمال تھا۔ مجھے خود اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ ٹیچر سمیت سبھی ہم جماعت بھی ہنسنے کے مشغلے میں شریک تھے۔

سبق ختم ہونے پر ٹیچر نے ایک بات کہی تھی ''پیارے بچو! حالانکہ سبق میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے۔ سبق کافی سہل اور آسان تھا۔ ساتھ ہی دلچسپ اور مزیدار بھی۔ میں نے سبق کے دوران بچوں کے چہرے بھی نوٹ کیے۔ کچھ بچے ایسے تھے جنہیں یہ سبق تھوڑا بہت بھی سمجھ میں آرہا تھا۔ وہ ضرور اس کا مزا لے رہے تھے۔ ایک کیٹیگری ان بچوں کی تھی جنہیں اردو کافی اچھی آتی ہے اور ایک کیٹیگری کے بچے وہ تھے جو صرف دوسروں کے چہرے دیکھ کر نمائشی ہنس رہے تھے۔ اکثریت ان ہی کی تھی۔''

''پیارے بچو! سوچ وفکر کا مقام ہے۔ اردو آپ کی مادری زبان ہے، اس سے آپ کی شناخت اور پہچان ہے۔ اس سے دور ہرگز مت جایئے۔ اسے پڑھیے۔ سمجھیے۔ اور جایئے! اسے اپنی زندگی میں رائج کیجیے۔ ذریعہ تعلیم یعنی میڈیم آف ایجوکیشن آپ کسی بھی زبان کو بنائیں، لیکن آپ کو اپنی مادری زبان ضرور آنی چاہیے۔ ورنہ یہی ہوگا کہ

بڑے ہو کر بھی آپ محفلوں میں یونہی نمائشی ہنسی ہنسنے پر مجبور ہوں گے۔"

وہ باتیں آج بھی دل و دماغ پر لکھی ہوئی ہیں۔

اکثر و بیشتر لوگ اٹھتے بیٹھتے یہ فرمائش کر دیتے ہیں کہ کوئی لطیفہ چٹکلہ سناؤ بھئی! یہیں!

اب کوئی ادبی لطیفہ، شگوفہ سنا دو تو ہنسی نہیں آئی۔ آئے گی بھی کیسے جب کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا اور سمجھ میں آنے کے لیے تو اردو آنی شرط ہے اور پھر سب سے بورنگ کام ہے لطیفہ سنانے کے بعد اسے سمجھانا۔

ایک اور بیماری جو لوگوں میں پائی جاتی ہے وہ ہے دیر سے کسی بات کا عقل شریف میں سمانا۔ شاید ان کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہوتا ہے یا قدرتی طور پر کوئی اور ٹیکنیکل پرابلم۔

بہت بچپن میں ایک کہانی سنی تھی۔ شاید آپ نے بھی سنی ہو۔ چڑیا گھر میں ایک جگہ لوگوں نے بہت سے جانوروں کو ایک ساتھ ہنستے ہوئے دیکھا، لیکن وہاں ایک جانور ایسا بھی تھا جو خاموش کسی سوچ میں گم تھا۔ واپسی پر دیکھا گیا کہ اب وہ زور زور سے ہنس رہا تھا جبکہ باقی سب خاموش کھڑے تھے۔ پوچھا گیا ایسا کیا ہے؟ کسی نے تعارف کرایا کہ یہ گدھا ہے۔ اس وقت سبھی جانور ایک ساتھ کسی بات پر ہنس رہے تھے، اور انہیں وہ بات اب جا کے سمجھ میں آئی ہے۔ اس لیے میاں گدھے اب قہقہے لگانے میں مصروف ہیں اور پھر کم عقل اور بیوقوف لوگوں کو گدھے جیسے بے چارے اور معصوم جانور سے تشبیہ دی جانے لگی۔

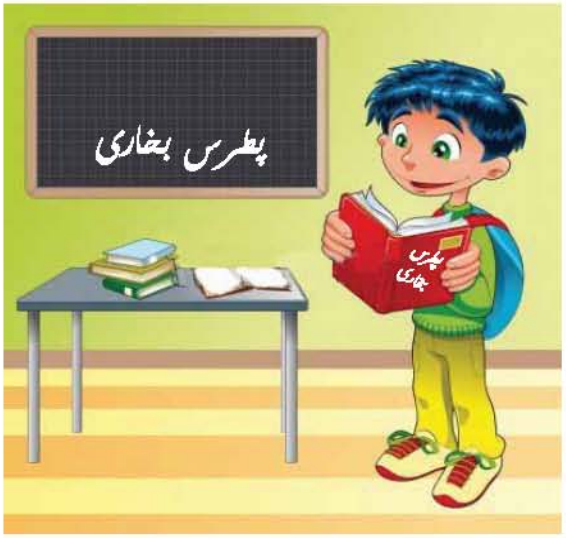

پیارے دوستو! حال ہی میں ہمارے نئے اور تازہ ریسرچ میں یہ پایا گیا ہے کہ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ بے وقوفوں کی صفت بھی کچھ بدل گئی ہے، پہچان کے لیے ہم ان کی خاصیت بتائے دیتے ہیں تاکہ آپ ان سے ہوشیار رہ سکیں۔

یہ عموماً کسی لطیفے یا چٹکلے پر تین بار ہنسنے کا شغل فرماتے ہیں۔ پہلی مرتبہ تب جب آپ سنانا شروع کریں گے۔ دوسری بار لطیفے کے اختتام پہ اس وقت جب سب ہنس رہے ہوں گے، اور تیسری مرتبہ تب جب ان کی عقل شریف میں وہ سمائے گا۔ یعنی سمجھ میں آئے گا۔

یہ تھا ایک ذاتی مشاہدہ، ہو سکتا ہے آپ نے بھی دیکھا ہو۔ اگر نہیں دیکھا تو آزمائش کر لیں۔ کسی کو اردو کا کوئی لطیفہ سنائیں اور دیکھیں وہ کیسے اور کتنا ہنستے ہیں۔ مگر ہاں، ذرا دھیان سے۔ کوئی برا نہ مان جائے! □

Mr M A Theboss / Mohd Atif E-437 Sec ond Floor Jaitpur Extn -II, Badarpur New Delhi- 110044

□ ریشما انجم

اچھل کود کا چیمپین:
اُودبِلاؤ

کیا آپ نے اود بلاؤ کا نام سنا ہے؟ یقیناً سنا ہوگا۔ لیکن صرف عام بول چال میں۔ اس بارے میں بہت کم جانتے ہوں گے کہ یہ کس قسم کا جانور ہے اور کہاں پایا جاتا ہے؟ یہ ایک ایسا جانور ہے جو پانی میں اچھل کود اور اٹکھیلی کے لیے مشہور ہے۔ یہ اس قدر صفائی پسند جانور ہے کہ پانی میں رہنے کے باوجود مچھلی کو پکڑ کر اسے کھانے سے پہلے انتا رگڑ رگڑ کر دھوتا ہے کہ مچھلی کی پوری کھال چھل جاتی ہے۔ انگریزی میں اس جانور کو Otter کہتے ہیں۔ یہ ویسے تو دنیا کے سبھی حصوں میں پایا جاتا ہے مگر یوروپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا اس کے خاص علاقے ہیں۔ سرد ملکوں کے سمندروں میں بحری اود بلاؤ یا Sea Otter بڑی تعداد میں ملتے ہیں جو اپنی بے حد قیمتی کھال کی وجہ سے مشہور ہیں۔

آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ ہمیشہ پانی میں کھیلنے کودنے

والے اود بلاؤ کے روئیں بھلے ہی گیلے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا جسم پوری طرح سوکھا رہتا ہے۔ انھیں ٹھنڈے برفیلے پانی میں بھی ٹھنڈ محسوس نہیں ہوتی۔ اس کا راز یہ ہے کہ ان کی کھال کے روئیں بہت گھنے (فی مربع انچ جلد پر 6,50,000 سے زیادہ) ہوتے ہیں۔ ان نرم روؤں کے اوپر حفاظتی بالوں کی پرت بھی ہوتی ہے جن کے بیچ پھنسی ہوا اود بلاؤ کو سخت ٹھنڈے پانی میں بھی کپکپی نہیں لگنے دیتی۔

پانی میں رہنے کے لیے اود بلاؤ کا جسم لمبا، پتلا اور نہایت ہی پھیلا ہوتا ہے۔ ان کے پاؤں چھوٹے اور ناخن نوکیلے ہوتے ہیں۔ اود بلاؤ کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس کے ناخن نہیں ہوتے۔ کیچڑ بھری جگہوں میں رہنے والا اود بلاؤ اپنے شکار کو ناخن سے پھاڑنے کے بجائے تیز دانتوں سے چباڈالتا ہے۔ اود بلاؤ کی یہ قسم افریقی اود بلاؤ کہلاتی ہے۔

یہ ایک گوشت خور جانور ہے اور مچھلی اس کی اہم غذا ہے۔ لیکن یہ مینڈک، کیکڑے اور گھونگھے بھی شوق سے کھاتا ہے۔ کچھ سمندری اود بلاؤ Sea Otter ایسے بھی ہیں جو سمندری پرندوں اور چھوٹے دودھ پلانے والے جانوروں کو بھی نشانہ بناتے ہیں۔ لیکن سبھی قسم کے اود بلاؤ میں ایک صفت یکساں ہے اور وہ یہ ہے کہ شکار خواہ کوئی بھی ہو، اسے پکڑ کر یہ سیدھے پانی کی طرف بھاگتے ہیں تاکہ کھانے سے پہلے اس کو رگڑ رگڑ کر دھو سکیں۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ پانی میں رہنے کی وجہ سے اسے زیادہ

طاقت کی ضرورت پڑتی ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں یہ خوب اچھل کود کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے خوب بھوک لگتی ہے، اور یہ بہت ہی پیٹو جانور ہے۔ ایک اوسط عمر کا اودبلاؤ روزانہ اپنے جسم کے ایک تہائی وزن کے برابر غذا کھاتا ہے۔ بہت ٹھنڈے برفیلے پانی میں رہنے والے اودبلاؤ کو ہر گھنٹے میں 100 سے 150 گرام مچھلی کھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

بچے اس جانور کی اچھل کود سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ قطب جنوبی اور آسٹریلیا کو چھوڑ کر اس کی 13 قسمیں پوری دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ اودبلاؤ زمین پر 300 لاکھ سال سے زیادہ وقت سے موجود ہے۔ یہ دودھ پلانے والا Mammal اور پانی و خشکی دونوں میں رہنے والا مچھلی خور جانور ہے جس کے جسم پر گھنا سمور ہوتا ہے اور پاؤں کی انگلیاں جھلی دار ہوتی ہیں۔ دراصل سمندری اودبلاؤ کی کھال کو ہی اردو میں سمور کہا جاتا ہے۔

اودبلاؤ کی اوسط عمر دس سال ہوتی ہے۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ بالغ اودبلاؤ کو انسان کے علاوہ کسی شکاری سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ جبکہ اس کے بچوں پر سمندری باز اور سفید شارک گھات لگائے

بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر بالغ اودبلاؤ آس پاس میں ہی رہیں تو سمندری باز اور سفید شارک بھی حملہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس قدر پیارے جانور کو خطرہ صرف انسان سے ہے جو قیمتی سمور Fur کی لالچ میں انھیں بے رحمی سے قتل کر ڈالتے ہیں۔

سمندری اودبلاؤ کی کھال بے حد قیمتی ہوتی ہے اور یہ کھال ہی اس کی سب سے بڑی دشمن ثابت ہوئی ہے۔ ایک زمانے میں بحری اودبلاؤ کی آبادی پوری دنیا میں ڈیڑھ سے تین لاکھ کے درمیان آنکی جاتی تھی۔ لیکن اٹھارہویں اور بیسویں صدی کے دوران اس کا اتنے بڑے پیمانے پر شکار ہوا کہ پوری دنیا میں صرف ایک دو ہزار سمندری اودبلاؤ باقی رہ گئے۔ قریب تھا کہ ان کی نسل بالکل ختم ہو جاتی۔ تبھی تمام دنیا میں اس کے شکار پر پابندی لگا دی گئی۔ دنیا بھر کے بازاروں میں سمور سے بنے ہوئے کوٹ، دستانے اور دوسری چیزیں بیچنے پر سخت پابندی لاگو کر دی گئی۔ اس کے نتیجے میں سی آٹرز کی آبادی پھر پھلنے پھولنے لگی اور اس وقت ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد ایک لاکھ کے آس پاس پہنچ چکی ہے۔ □

اودبلاؤ کی کھال سے بنایا گیا سامان

Ms Reshma Anjum c/o N M Ansari VIII PO Sarlia Kashipur Samastipur . 848101 Bihar

□ محمد فضل اللہ رومی

ایک گھنٹہ چڑیا گھر میں

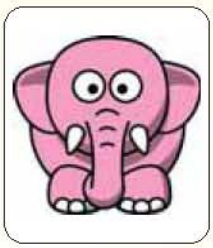

ہم نے ایک دن چڑیا گھر میں
سب کچھ دیکھا گھنٹے بھر میں

ہاتھی دیکھا بندر دیکھے
طوطا مینا تیتر دیکھے

کالا کالا بھالو دیکھا
منہ میں اس کے آلو دیکھا

چڑیاں کالی پیلی دیکھیں
لال ہری اور نیلی دیکھیں

شیر کو بھی غراتے دیکھا
اپنی دھاک جماتے دیکھا

رومی چڑیا گھر کے اندر
خوب پھرے اور آئے گھر پر

♦Mr Y M Faziullah RoomHM Retd, 43 Bamakkara 4th Street Ambur, Dist Vellore- 635802 TN

بھولا بھالو!
ریچھ کے بچّے
کی حماقتیں!
اہاہا...اوہوہو...
...کیا صبح سہانی ہے!!...
اوہ، شاید صبح ابھی سہانی
نہیں ہوئی ہے

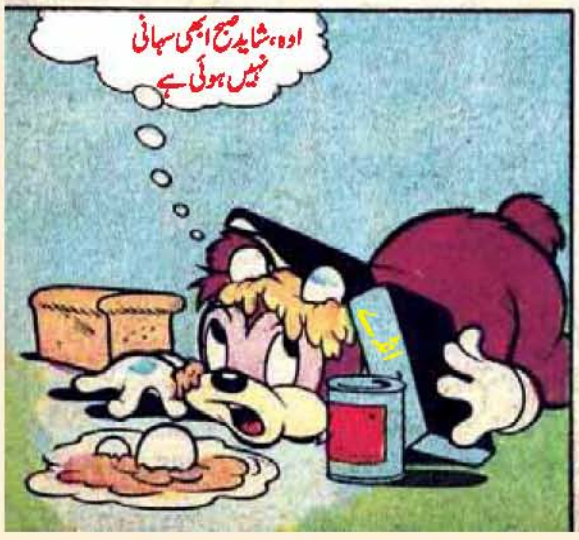

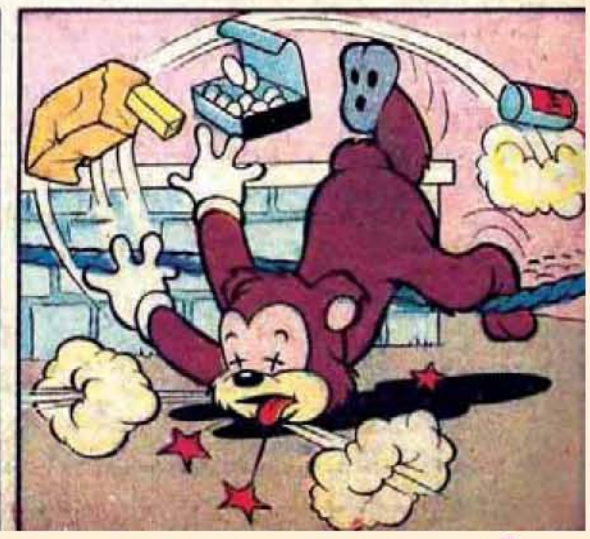

ڈرو نہیں بھولو، ٹامی تو بس کھیلنا چاہتا ہے، کاٹے گا نہیں!
یہ پٹڑ نہ ٹوٹا تو اس کا موقع اسے نہیں ملے گا، بھگاؤ اس کو یہاں سے!
سنو، کپتان صاحب باہر جا رہے تھے تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ تم ٹامی کا خیال رکھو گے
ٹھیک ہے، میں خیال رکھوں گا، بس تم مجھے وہ رسّی دے دو چکو!
ب چا ؤ!
بچاؤ! بچاؤ! کوئی مجھے بچاؤ! ایک بلا یہاں کھلی پھر رہی ہے!

یہ گینڈا میرے ساتھ نہیں رہے گا اسے طے سمجھو
بس اسٹاپ
اور میں اسے خود واپس لے جا رہا ہوں تا کہ یہ اور گڑبڑ نہ کر سکے
بس اسٹاپ
چھوڑنا نہیں بھولو، ٹامی کو کچھ ہو گیا تو کپتان صاحب آفت مچا دیں گے
چھوڑ کیسے سکتا ہوں، اس کی رسّی ہاتھ پر لپٹ گئی ہے
چھناک!
بس اسٹاپ
باہر آؤ ٹامی، تم مزے سے بس میں نہیں رہ سکتے! باہر آؤ نہیں تو میں...

Buster Bear سے ماخوذ/ترجمہ: شبنم پروین

□ساحر لدھیانوی

بچّے من کے سچّے

بچّے من کے سچّے سارے جگ کی آنکھ کے تارے
یہ وہ ننھے پھول ہیں جو بھگوان کو لگتے پیارے

خود روٹھیں خود من جائیں
پھر ہم جولی بن جائیں
جھگڑا جس کے ساتھ کریں
اگلے ہی پل پھر بات کریں
ان کو کسی سے بیر نہیں
ان کے لیے کوئی غیر نہیں
ان کا بھولا پن ملتا ہے سب کو بانہہ پسارے

انساں جب تک بچّہ ہے
تب تک سمجھو سچّا ہے
جوں جوں اس کی عمر بڑھے
من پر جھوٹ کا میل چڑھے
کرودھ بڑھے نفرت گھیرے
لالچ کی عادت گھیرے
بچپن ان پاپوں سے ہٹ کر اپنی عمر گزارے

تن کومل من سندر ہیں
بچّے بڑوں سے بہتر ہیں
ان میں چھوت اور چھات نہیں
جھوٹی ذات اور پات نہیں
بھاشا کی تکرار نہیں
مذہب کی دیوار نہیں
ان کی نظروں میں اک ہیں مندر مسجد گوردوارے

بچّے من کے سچّے سارے جگ کی آنکھ کے تارے
یہ وہ ننھے پھول ہیں جو بھگوان کو لگتے پیارے

□ نصرت ظہیر

دوستو! پتہ نہیں آپ کے ساتھ کبھی ایسا ہوا ہے یا نہیں، لیکن میرے ساتھ ایک روز بڑا ہی عجیب واقعہ پیش آیا۔ آپ سنیں گے تو حیرت کریں گے۔

ہوا یہ کہ گرمیوں کے دن تھے اور بجلی بار بار آجا رہی تھی۔ اس وجہ سے چھت پر جا سویا تھا۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ تھوڑی دیر بعد آنکھ کھل جاتی تھی۔ اچانک صبح کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تو پسینے سے نجات ملی اور میں گہری نیند سو گیا۔

تبھی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں بستر پر لیٹا خراٹے لے رہا ہوں اور میرے ہاتھ پاؤں، ناک، کان وغیرہ جاگ رہے ہیں اور نہ صرف جاگ رہے ہیں بلکہ آپس میں خوب مزے سے باتیں بھی کر رہے ہیں۔

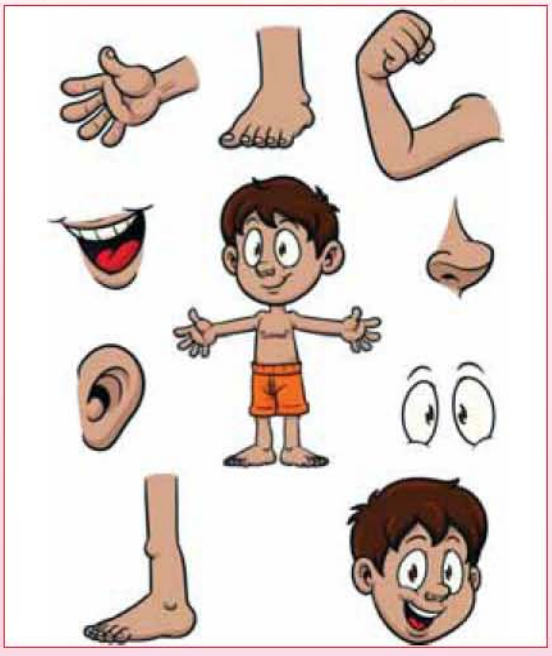

خود کو اس حالت میں دیکھ کر میں ڈر گیا۔ پہلے تو مجھے ایسا لگا کہ میرا انتقال پُر ملال ہو چکا ہے اور یہ میری روح ہے جو مجھے یوں سویا ہوا دیکھ رہی ہے مگر پھر خیال آیا کہ اگر میں مر چکا ہوں تو خراٹے کیوں لے رہا ہوں؟ مُردے تو خراٹے نہیں لیا کرتے۔ تو پھر کہیں یہ کوئی خواب تو نہیں؟

یہ پتا لگانے کے لیے کہ میں زندہ ہوں یا مر گیا ہوں یا محض خواب دیکھ رہا ہوں میں نے اپنے بازو میں زور کی چٹکی بھری۔ درد کی ایک تیز لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی اور میں نے نیند میں زور سے اپنا ہاتھ جھٹک دیا۔ درد کا مطلب ہے زندگی! یعنی میں زندہ تھا۔

اب تو میری گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ میں زندہ بھی ہوں، سویا ہوا بھی ہوں اور خود کو سویا ہوا دیکھ بھی رہا ہوں، یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

اس دوران میرے جسم کے حصوں کی آپس میں بات چیت جاری تھی۔ گھبراہٹ دور کرنے کے لیے میں ان کی باتیں سننے لگا۔

جس بازو کی چٹکی بھری گئی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

"کیوں! بھئی یہ کس کی حرکت ہے؟ میرا خیال ہے کہ بائیں بازو صاحب یہ آپ ہیں۔ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے آپ۔ اگر کہیں مجھے بھی کچھ الٹی سیدھی سوجھ گئی اور غصہ آگیا تو پھر آپ پچھتائیں گے۔"

"لعنت ہے!" بایاں بازو غصے سے

بولا۔ "ہر وقت میرے ہی پیچھے پڑے رہتے ہو۔ دیکھتے نہیں کب سے میں اس ظالم انسان کے سر کے نیچے دبا ہوا ہوں۔ ہل بھی نہیں سکتا۔"

ظاہر ہے ظالم انسان اس نے مجھے کہا تھا۔ جی میں آیا کہ گستاخ کی خوب خبر لوں اور اسے ایک چپت رسید کر دوں مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ دیکھوں تو سہی میرے پیچھے یہ لوگ میرے بارے میں کیا باتیں کرتے ہیں۔ یعنی:

کہتی ہے مجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟

لوگ میرے پیچھے میرے بارے میں کیا کیا باتیں کرتے ہیں؟

ناک کہہ رہی تھی "بھئی! ہوا کیا آخر؟"

"ہونا کیا ہے۔" دائیں بازو نے کہا "ابھی کسی نے بہت زور کی چٹکی بھری ہے۔"

"میں نے تو کسی کو چٹکی بھرتے ہوئے نہیں دیکھا۔" ناک نے حیرت کا اظہار کیا

"مگر آپ دیکھ کیسے سکتی ہیں محترمہ" دایاں کان ہنس کر بولا۔ "آپ کا کام دیکھنا نہیں، سونگھنا ہے اور معاف کیجئے وہ کام بھی آپ اکثر ٹھیک طرح نہیں کرتیں۔ کل دوپہر جب یہ شخص (اشارہ یقیناً میری طرف تھا) کسی کے باغ میں چوری چھپے آم توڑتا پھر رہا تھا تو آپ فرما رہی تھیں، کہیں رات کی رانی مہک رہی ہے جبکہ صاف چنبیلی کی خوشبو آ رہی تھی۔ ویسے رات کی رانی رات کو مہکتی ہے دوپہر کو نہیں اور ہاں کل ہی کی بات ہے باورچی خانہ میں لہسن کا بگھار دیا جا رہا تھا اور آپ کہہ رہی تھیں کہ یہ ہینگ کس نے چولہے میں ڈال دی۔"

ناک یہ سن کر شرما گئی۔ "وہ تو دراصل آج کل مجھے نزلہ ہو رہا ہے اس لیے ٹھیک سے سنگھائی نہیں دیتا۔ کاش کوئی اس شخص کو سمجھائے (یعنی مجھے) ابا اور امی روزانہ اسے گرم جوشاندہ پینے کو دیتے ہیں مگر یہ پیتا نہیں۔ نظر بچا کر چپکے سے کھڑکی کے باہر پھینک دیتا ہے۔ خراب برف کی آئس کریم بازار سے لے کر خود کھاتا ہے اور نزلہ مجھے جھیلنا پڑتا ہے۔ پھر یہ رومال کا استعمال بھی نہیں کرتا۔ ہمیشہ الٹے ہاتھ یعنی بائیں بازو کی آستین سے ہی مجھے صاف کرتا ہے۔"

"ہاں بھئی! مجھے تو بڑی گھن آتی ہے۔" بائیں بازو نے بُرا سا منہ بنایا۔

"واقعی یہ آپ نے ٹھیک کہا۔" اس مرتبہ بائیں ٹانگ بولی۔ "یہ آدمی گندا بہت رہتا ہے اور ننگے پاؤں گھومنے میں تو اسے بڑا مزا آتا ہے۔ ایک روز سڑک پر کٹی ہوئی پتنگ کے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں نظر کہاں تھی کہ گھپ سے پاؤں گوبر میں جا پڑا۔ اور ہاں، اس روز چھت پر ننگے پاؤں پتنگ بازی ہو رہی تھی۔ کمبخت سے ایک تختے میں لگی ہوئی کیل میری ایڑی میں گھپ گئی۔ اس قدر تکلیف ہوئی اور اتنا خون بہا کہ کچھ نہ پوچھو۔ ٹیٹنس کا انجکشن الگ سے لگوانا پڑا۔"

"جی ہاں خطا پاؤں کی تھی اور بھگتنا مجھے پڑا۔" بائیں بازو نے شکایت کی۔ "یہ ڈاکٹر حضرات بھی عجیب ہیں۔ درد کہیں ہو، چوٹ کہیں لگی ہو مگر انجکشن کھٹ سے مجھے لگا دیں گے یعنی کرے کوئی بھرے کوئی۔"

مگر ٹانگ اپنی ہی کہے جا رہی تھی۔ "امی اسے لاکھ سمجھاتی ہیں کہ بھئی کبھی کبھار پتنگ اڑانے اور کھیل کو کھیل کے وقت کھیلنے سے ہم منع نہیں کرتے لیکن ننگے پاؤں تو مت کھیلو۔ مگر صاحب! یہ سنتا کہاں ہے۔ ایک کان سے سنی دوسرے سے نکال دی۔"

"جی! مجھے کہا آپ نے؟" بایاں کان چونک کر بولا۔

"نہیں میں تو محاورہ کہہ رہی تھی۔ ایک کان سے سننا، دوسرے سے نکال دینا۔" ٹانگ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"توبہ، کتنا غلط محاورہ ہے۔" بائیں کان نے کہا۔ "سچ پوچھیے تو یہ

محاورہ نہیں بہتان ہے ہم پر۔ یقین کیجئے ہم اپنے فرض سے کبھی غافل نہیں رہتے۔ ہر بات ٹھیک سے سنتے اور اسے دماغ تک پہنچا دیتے ہیں۔ ہاں کوئی کانوں میں انگلی دے کر بیٹھ جائے، ہمارا میل صاف نہ کرے یا ماچس کی تیلی وغیرہ سے کرید کرید کر ہمارا پردہ پھاڑ ڈالے تو بات دوسری ہے۔ اس محاورے کو سن کر تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے دونوں کان کسی نلکی سے آپس میں جڑے ہوئے ہوں اور اس میں پھنکنی کی طرح ایک طرف سے ہوا بھری جائے تو دوسری طرف سے نکل جائے گی۔

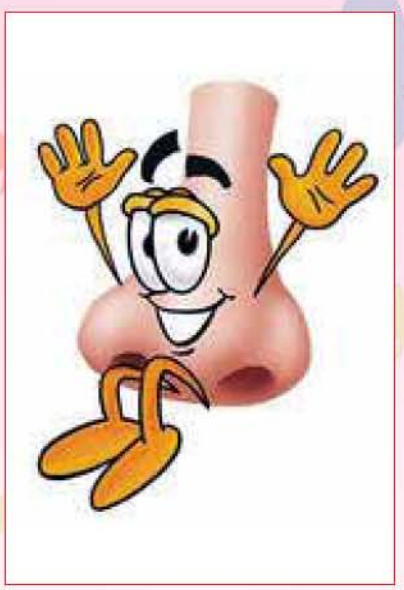

کبھی کسی شخص کے کان میں کچھ بولیے اور کسی دوسرے سے کہیے کہ اس کے دوسرے کان سے اپنا کان لگا کر سننے کی کوشش کرے۔ اسے کچھ بھی نہیں سنائی دے گا اور محاورہ غلط ثابت ہو جائے گا۔ آزمائش شرط ہے۔"

"اوفوہ! بھئی! تم تو بال کی کھال نکالنے بیٹھ گئے۔ چھوڑو ان باتوں کو۔" ٹانگ نے سنی ان سنی کر دی۔ "ذکر اس آدمی کی خراب عادتوں کا چل رہا تھا۔ اب دیکھئے گھر میں ماشا اللہ کسی چیز کی کمی نہیں۔ ابا ہر روز بازار سے پھل یا مٹھائی گھر لاتے رہتے ہیں مگر اسے جب دیکھئے پڑوس کے باغ میں چوری سے آم یا امرود توڑنے نکل جاتا ہے۔ پتا نہیں چوری کے پھل کھانے میں اسے کیا مزہ آتا ہے۔ کل ہی کی بات لے لیجیے۔ جامن کے پیڑ پر چڑھتے ہوئے میرا گھٹنا چھل گیا۔ وہ تو یہ کہیے کہ دائیں بازو نے بڑی سی شاخ پکڑ کر گرنے سے بچا لیا، ورنہ یہ شخص تو گر کر میری ہڈی پسلی ہی توڑ دیتا۔"

"پسلی؟" دایاں کان ہنسا۔ "ٹانگ کی پسلی؟ بھلا آپ کی بھی پسلی ہے کوئی؟"

"بھئی محاورہ ہے۔ ہڈی پسلی ٹوٹنا۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے بھلا؟" ٹانگ نے اٹھلا کر کہا۔

"آپ محاورے بہت بولتی ہیں۔" ناک مسکرائی۔

"بھئی مجھے اس آدمی کی ایک عادت بڑی خراب لگتی ہے۔" دائیں بازو نے اعلان کیا۔

"وہ کیا؟" دائیں کان کے کان کھڑے ہو گئے۔

"یہ شخص کھانا کھانے کے بعد تو ہاتھ دھو لیتا ہے مگر کھانے سے پہلے بالکل نہیں دھوتا جب کہ یہ صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ امی ہمیشہ اس کی تاکید کرتی ہیں۔ کھیل کود اور دوسرے کاموں میں کئی بار گندگی اور میل ہاتھوں کو لگ جاتا ہے اور ہاتھ دھوئے نہ گئے ہوں تو یہ سب کھانے کے ساتھ پیٹ میں چلا جاتا ہے جس سے طرح طرح کی بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ یہی ناخنوں کا معاملہ ہے۔ ہفتہ میں کم از کم دو بار ناخن ضرور تراش لینے چاہئیں۔ نہیں تو بڑھے ہوئے ناخنوں کے اندر جمع ہونے والی گندگی سڑنے لگتی ہے۔ اس میں جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ روٹی کے نوالے توڑتے وقت پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ سب سمجھ داری کی باتیں ہیں اور ہر بچے کو چاہیے کہ ان پر عمل کرے مگر یہ شخص دھیان ہی نہیں دیتا۔ دیکھ لینا کسی دن بہت پچھتائے گا۔"

تبھی ایک زور کے خراٹے کے ساتھ میرا منہ اس طرح کھل گیا کہ زبان کی نوک ذرا سی باہر کو نکل آئی۔ خراٹے کی آواز اس قدر دھماکہ خیز تھی کہ میرے جسم کے سبھی اعضا اپنی اپنی جگہ خوف سے اچھل گئے۔

"کاش کوئی اسے کروٹ سے سلا دے۔ کم از کم یہ خوفناک خراٹے تو کسی طرح بند ہوں۔" ناک بلبلائی۔

"بھئی یہ تکلیف ذرا آپ لوگ ہی کیجئے۔"

دائیں کان نے ہاتھ پیروں سے درخواست کی۔ کچھ دیر بعد ہاتھ پاؤں مجھے کروٹ دلانے میں کامیاب ہوگئے اور کروٹ لیتے ہی خراٹوں کی آواز بھی بند ہوگئی۔

''ارے بھئی مس زبان! آپ ابھی تک خاموش ہیں۔ آپ بھی تو کچھ کہیے۔ کچھ ہماری سنیے کچھ اپنی سنائیے۔'' دائیں ہاتھ نے فرمائش کی۔

''بھئی ہمیں تو رہنے ہی دیجیے۔'' زبان نے منہ کھولا۔ ''ہمارے قصے میں بھلا کسی کو کیا دل چسپی ہوسکتی ہے۔ بقول شاعر:

کس کو فرصت ہے کہ کوئی داستانِ غم پڑھے
لاکھ تم اترا ہوا چہرا لیے پھرتے رہو

کوثر تسنیمی سہارنپوری

''پھر بھی کچھ تو کہیے۔ سننے سنانے سے جی ہلکا ہوتا ہے۔'' ناک نے کہا۔ ''اور پھر آپ کا تو بولنے کا سب سے زیادہ حق بنتا ہے۔ سب آپ کی آواز سے ہی بولتے ہیں۔''

''نہیں بھئی! یہ درست نہیں ہے۔'' زبان نے سمجھایا۔ ''میری اپنی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اصل آواز تو گلے میں پیدا ہوتی ہے۔ میں تو بس ذرا اپنی حرکت سے اس آواز کے سُر بدل دیتی ہوں۔ ان ہی سروں سے حرف بن جاتے ہیں اور حروف سے لفظ پھر کئی لفظ مل کر جملے بنادیتے ہیں۔ یوں بات ہونے لگتی ہے۔''

''لیکن کریڈٹ تو آپ ہی کو جاتا ہے نا۔'' دائیں ٹانگ بولی۔

''اس لیے آپ بھی کچھ اپنی بات کہیے۔ کیا آپ کو اس سوئے ہوئے شخص سے کوئی شکایت نہیں؟''

''شکایت کیوں نہیں۔ بلکہ ایک شکایت ہو تو کہوں۔ میرا تو وہی حال ہے کہ بقول شاعر :

افسوس ہے کہ کتنے سخن
ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے
ناگفتہ رہ گئے

شعر سنتے ہی ناک کو زور کی چھینک آگئی۔

کان نے بھی کان کھجاتے ہوئے کہا ''بڑا مشکل شعر ہے بھئی۔''

''کوئی مشکل نہیں۔ بلکہ یہ تو بڑا آسان اور سیدھا شعر ہے۔'' بایاں بازو بولا۔

''اچھا تو ذرا آپ ہی اس کا مطلب سمجھا دیجیے۔'' دائیں بازو نے اس طرح کہا جیسے اسے چیلنج کر رہا ہو۔

''بھئی! سیدھی سی بات ہے۔ شاعر معشوق سے کہتا ہے کہ افسوس کتنے سارے سخن ہائے گفتنی خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے۔''

''بائیں بازو صاحب پلیز! مذاق نہیں۔ ذرا آسان لفظوں میں سمجھایئے۔'' دائیں بازو نے کہا۔

''اور ہاں، یہ شعر میں معشوق کہاں سے آگیا۔'' زبان بولی۔

''اس کی فکر نہ کرو۔ اردو شاعر جب بھی اور جو بھی کہتا ہے وہ معشوق سے ہی کہتا ہے۔'' بائیں ٹانگ نے کہا۔

''توبہ! کتنے بدچلن ہیں یہ اردو

شاعر۔ خدا انھیں عقل دے۔'' مس زبان نے تبصرہ کیا۔

''اوفوہ، آپ کی باتوں میں شعر تو رہ ہی گیا۔ ہاں بھئی بائیں بازو صاحب ذرا آسان لفظوں میں شعر کا ترجمہ کیجیے۔'' دایاں بازو بولا۔

''اچھا تو سنیے! شاعر کہتا ہے کہ سخن ہائے گفتنی، یعنی کہنے کے لائق کئی باتیں ایسی تھیں جو میں نے اس لیے نہیں کہیں یعنی انھیں ناگفتہ رکھنا پڑا کہ مجھے خلق یعنی لوگوں میں ان پر فساد یعنی جھگڑا ہونے کا خوف تھا! مطلب یہ کہ میں وہ باتیں کہتا تو اس سے لوگوں میں دنگا فساد ہو جاتا۔ بس اتنی سی بات ہے۔'' بائیں بازو نے وضاحت سے سمجھایا۔

''اور اس بات کا شاعر کو افسوس ہے۔ لاحول ولاقوۃ'' دائیں بازو نے طنز کیا۔

''بھئی! یہ شاعر تو بڑا شریر معلوم ہوتا ہے۔ اس بات پر افسوس کر رہا ہے کہ لوگوں میں جھگڑا نہیں کرا سکا۔ توبہ توبہ۔'' ناک نے بُرا سا منہ بنایا۔

''کچھ پتا بھی ہے یہ شعر کس کا ہے؟'' بائیں بازو نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔

''کس کا؟'' سب بیتابی سے ایک ساتھ بولے۔

''ایک شاعر کا۔''

''اوہ!'' سب کے منہ لٹک گئے۔

''چلیے جانے دیجیے۔ شاعر نے یقیناً کوئی عقل کی بات کہی ہوگی۔ ہم ہی سمجھنے سے قاصر رہے۔ حضرات میں اپنا پچھلا بیان واپس لیتی ہوں۔'' ناک نے پہلے بار کوئی عقل کی بات کہی۔

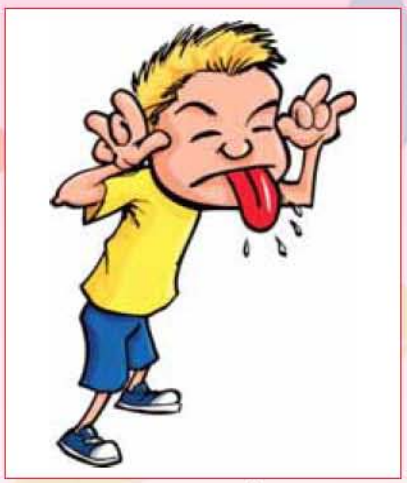

''محترمہ آپ کچھ شکایتوں کا ذکر کر رہی تھیں۔'' کان نے زبان کو یاد دلایا۔

''ہاں میں کہہ رہی تھی کہ اس شخص سے شکایتیں تو بہت سی ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ سناؤں تو کیسے سناؤں۔ شاعر پہلے ہی کہہ گیا ہے۔ کہ...''

''اوفو! پھر شعر!'' ناک نے احتجاج کیا۔

''ارے بھئی سن لینے دیجیے۔'' بائیں بازو نے کہا ''ہاں محترمہ ارشاد عالی۔ شاعر کیا کہہ گیا ہے۔''

زبان بولی ''شاعر کہتا ہے کہ:

سنے بھی کوئی تو کیسے سنے گا داستاں میری
ازل سے قید ہے بتیس دانتوں میں زباں میری

''واہ واہ! سبحان اللہ'' سب ایک ساتھ چلائے۔ ''کیا ثبوت کے ساتھ بات کہی ہے۔ کیا زبردست دلیل دی ہے بے زبانی کی۔ کیا بات ہے مکرر ارشاد۔''

اس کے بعد زبان کو کئی مرتبہ شعر سنانا پڑا تب کہیں جا کر سب کو قرار آیا۔ شعر سن کر جس طرح یہ لوگ پھڑک اٹھے تھے اس سے بالکل مشاعرے کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

''خیر اب میری بات سنیے'' زبان بولی۔ ''سب سے بڑی شکایت مجھے اس شخص سے یہ ہے کہ مجھے ذرا بھی آرام نہیں دیتا۔ ہر وقت چخ چخ کرتا رہتا ہے۔ قینچی کی طرح استعمال کرتا ہے میرا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ زیادہ سنو کم بولو مگر یہ الٹا ہی کرتا ہے۔ اور چٹورا تو اس قدر ہے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ نمکین چیز کھائے تو کہے گا اب میٹھے کو جی چاہ رہا ہے۔ میٹھا کھائے گا تو نمکین کو جی کرے گا۔ پھر کہے گا

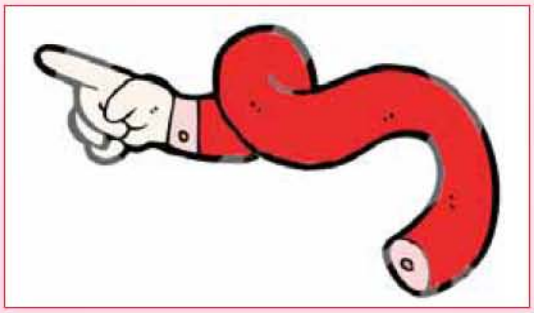

نمکین سے جی بھر گیا اب میٹھا چاہیے۔ بس اسی طرح چلتا رہے گا۔ سب سے زیادہ تکلیف تب ہوتی ہے جب یہ چاٹ، دہی بڑے کھاتا ہے، اس میں اتنی مرچ ڈلوائے گا کہ میں تلملا اٹھتی ہوں۔ ساری کی ساری جل جاتی ہوں۔ بڑے بزرگ سمجھاتے ہیں کہ تیز مرچ کھانے سے معدے، آنت اور جگر کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بینائی کمزور ہو جاتی ہے، مگر یہ سنتا ہی نہیں۔ پھر ایک بُری عادت یہ ہے کہ گرم گرم حلوہ یا شیر خورما سامنے ہو تو فوراً اس پر ٹوٹ پڑے گا۔ یہ نہیں کہ انھیں تھوڑا ٹھنڈا ہونے دے اور پھر آرام سے کھالے۔ مگر نہیں! ہر بار جلدی مچائے گا اور پھر تکلیف سے ناچتا پھرے گا۔ سچ کہتی ہوں کئی بار تو میرے اوپر چھالے پڑ جاتے ہیں۔ کسی بھی لذیذ چیز کو اطمینان سے کھانے کے بجائے اس تیزی سے منہ چلا کر جلدی جلدی کھاتا ہے کہ کئی بار اس کے خوفناک دانتوں کے نیچے آجاتی ہوں۔ ایک مرتبہ تو کٹنے سے خون نکل آیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ کہاں تک کہوں۔ جان عذاب میں ہے۔ اس شخص کے ساتھ بقول شاعر:

یہاں تو بات کرنے سے بھی کٹتی ہے زباں میری
مری خاموشیوں کو ہی سمجھ لیں داستاں میری

پوری چھت داد اور واہ واہ کے شور سے ہلنے لگی۔ یہاں تک کہ کانوں نے بھی اپنے اوپر ہاتھ رکھ لیے۔ پھر جب شور تھما تو ایک کان بولا۔

''حضرات یہ سب شکایتیں تو اس شخص سے تھیں لیکن میری ایک شکایت اس سے نہیں اس کے بڑوں سے ہے جن میں اس کے والد، والدہ، چچا، ماموں، بڑے بھائی، بہن یہاں تک اسکول کے ماسٹر حضرات بھی شامل ہیں۔''

کان کے اس اعلان پر سب ہمہ تن گوش ہو گئے کیونکہ یہ واقعی ایک نئی بات تھی ورنہ اب تک تو تمام غیبت میری ہو رہی تھی۔

کان بولا۔ ''میری شکایت یہ ہے کہ کئی معاملوں میں قصور تو اس شخص کا ہوتا ہے مگر لوگ سزا دینے کے لیے مجھے اینٹھتے ہیں۔ باغ سے امرود یہ چرائے گا اور مسل دیں گے مجھے۔ شرارت یہ کرے گا اور تھپڑ ماریں گے مجھ پر۔ سبق یہ بھول جائے گا اور ٹیچر حضرات مروڑ دیں گے مجھے۔ کیا کوئی ان لوگوں کو یہ نہیں سمجھا سکتا کہ جو بات نرمی سے، محبت سے اور پیار سے سمجھائی جا سکتی ہے اس کے لیے اتنا تشدد اور مار پیٹ کیوں؟ اور پھر جھانپڑ مارنے والے کو یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ اس طرح کئی بار میرا پردہ بھی پھٹ جاتا ہے جس سے آدمی بہرہ ہو سکتا ہے۔ پتہ نہیں یہ بات لوگوں کی سمجھ میں کب آئے گی۔ نرمی اور پیار کا سختی اور پٹائی سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مارنے پیٹنے سے بچے کچھ سمجھتے نہیں بلکہ اور بگڑتے ہیں۔ جو بات بچے کو ایک مرتبہ پیار کر کے سمجھائی جا سکتی ہے اسے وہ بار بار سختی کرنے سے بھی نہیں سمجھ سکتا۔''

جی کو لگتی یہ بات سن کر جی چاہا کہ آگے بڑھ کر کان کا منہ چوم لوں۔

''شکریہ دوست۔ آخر کسی نے تو میرے حق کی بات کہی۔''

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میری آواز سن کر سب سہم گئے۔ سبھی نے ڈر کر منہ چھپا لیا۔

''ڈرو نہیں۔'' میں نے کہا ''میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری باتوں کا پورا خیال رکھوں گا اور اب تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

ناک کو میری بات پر اس قدر زور کی چھینک آئی کہ سچ مچ میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو میں چھت پر لیٹا ہوا تھا۔ سورج نکل آیا تھا اور اس کی ترچھی دھوپ میری ناک میں گھسی جا رہی تھی۔

چھت پر صبح ہو گئی تھی! □

♦ بچوں کے لیے لکھے گئے نصرت ظہیر کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کی کتاب 'شرارتوں کا مشاعرہ' سے جو مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر نئی دہلی نے 2002 میں چھاپی تھی

□ محمد خلیل

تین سو سال پرانا علم کا جادو گھر:
جنتر منتر

ہم نے بچپن میں ستاروں کو جھلملاتے ہوئے دیکھا تھا اور آسمان میں دور تک ستاروں کو گننا ہمیں اچھا معلوم ہوتا تھا۔ پھر ہم نے یہ سمجھ لیا کہ یہ بہت مشکل ہے۔ یہ تو دور تک بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ کتنے شمار ستارے جن میں سے کچھ کے ہی نام ہم نے سنے تھے آخر کہاں سے آتے ہیں اور دن کے اجالے میں یہ ہمیں کیوں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ سوالات ہم سوچتے رہتے تھے۔ ستاروں بھرا آسمان کتنے ہی عجیب رازوں سے بھرا ہوا ہے جن میں سے کچھ کا ہی ہمیں ابھی تک علم ہوا ہے۔

آپ شاید جانتے ہوں گے کہ سورج جو روز نکلتا اور ڈوبتا ہے وہ بھی ایک ستارا ہی ہے اور اس کے چاروں طرف ہی ہماری زمین دوسری کئی اور زمینوں کے ساتھ جنھیں ہم سیارہ کہتے ہیں چکر لگاتی رہتی ہے۔ سیاروں کے اس گھومنے کے نظام کو ہم شمسی نظام کہتے ہیں۔ یا کہہ لیجیے، سورج کا نظام۔ شمسی نظام کے ان سیاروں کی اور ان کے ہر روز کے مقام میں جو تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اس کی جانکاری ہمیں علم نجوم سے ملتی ہے، جسے آپ ستاروں اور آسمان کی سائنس بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سائنس کا ہمارے ہندوستان میں پرانے زمانے سے سلسلہ چلا آرہا ہے۔ علم کے اسی میدان کی ایک بڑی شخصیت تھے جے پور کے راجہ سوائی جے سنگھ (دوئم) جو 1688 میں پیدا ہوئے تھے اور 1743 میں انھوں نے انتقال کیا۔ ان کی دلچسپی علم نجوم میں ریاضی (حساب) یعنی میتھ میٹکس کی وجہ سے تھی۔ وہ اس وقت کے کلینڈر کو بہتر بنانا چاہتے تھے۔ کلینڈر میں کئی مشکلیں تھیں جو ستاروں کی کئی طرح کی سمتوں اور سیاروں کی جگہ کے حساب کتاب میں فرق کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں۔ ان ستاروں اور سیاروں میں تبدیلی مختلف قسم کی حرکتوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ راجہ سوائی جے سنگھ نے شہر جے پور بسایا، علم نجوم کو گہرائی سے پڑھا خاص طور سے نجوم کے ماہر کلاڈیس ٹالیمی

▲ علم فلکیات میں دل چسپی لینے اور جے پور شہر بسانے والے راجہ جے سنگھ دوئم

Claudius Ptolemy اور وگ بیگ کی مشہور کتابیں جو اُن کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ اس کا ذکر بھی ملتا ہے کہ جے سنگھ نے دوربین بنانے کی ابتدا کی تھی۔ اس زمانہ میں کائنات کا مرکز زمین کو خیال کیا جاتا تھا اور ماہرین کا کہنا تھا کہ سبھی سیارے زمین کا چکر لگاتے ہیں۔ لیکن مشہور سائنسداں کاپرنیکس نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کردیا تھا کہ زمین اور دوسرے سیاروں کا مرکز زمین نہیں بلکہ سورج ہے اور سبھی سیارے سورج کے چاروں طرف گھومتے ہیں۔ اس طرح سوائی جے سنگھ نے نئی جانکاریوں کو مشاہدے کے بعد جمع کیا اور انھوں نے 1724 میں دلی میں 'جنتر منتر' جیسی ایک عجیب وغریب عمارت بنوائی جس کی مدد سے ماہرین زمین سورج اور سیاروں کی پوزیشن کا مطالعہ کرسکتے تھے۔ انھوں نے مختلف جگہوں پر جیسے جے پور، اجین، وارانسی اور متھرا میں بھی ایسی ہی 'مشاہدہ گاہیں' تعمیر کرائیں۔ متھرا کی نجوم کے آلات کی تعمیر اب باقی نہیں ہے۔

دلی کا جنتر منتر کافی مشہور ہے۔ اسے دلی کے لوگ اور باہر سے آئے سیاح (ٹورسٹ) بڑی تعداد میں روزانہ دیکھنے آتے رہتے ہیں۔ دلی کے کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو کبھی اس کے پاس سے ہوکر نہ گزرے ہوں۔ اس جنتر منتر میں چودہ ہندسی (جیومیٹرک) آلات کا استعمال وقت کو ناپنے، موسم میں تبدیلی کا وقت سے پہلے اندازہ کرنے، سیاروں کی حرکت اور تبدیلی وغیرہ کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ جنتر منتر میں کئی طرح کے مستقل ڈھانچے جو تعمیر کیے گئے ہیں کسی خاص جانب اشارہ کرتے ہیں۔ ان میں کچھ آلات بہت خاص قسم کے ہیں۔ جیسے سمراٹ جے پرکاش ینتر جو تعمیری آلات میں سب سے بڑا ہے اور تقریباً نوے فٹ اونچا ہے۔ اس کی پرچھائیں کے ذریعے دن کے صحیح وقت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے قریب بڑی عمارتوں کے بن جانے سے ان آلات کے ذریعے حساب لگانے پر برا اثر پڑا ہے۔ اس کا استعمال دن رات کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ بالکل صحیح وقت بتانے والی دھوپ گھڑی (سوریہ گھڑی) ہے۔ اس کے ذریعے کسی جگہ سے سورج کا جھکاؤ اور سورج کی اونچائی ناپی جاسکتی ہے۔ اس میں گھنٹے منٹ اور سیکنڈ کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ نشان پر دیوار کی پرچھائیں پڑتی ہے اور اس کے ذریعے بیس سیکنڈ تک کے وقت کو معلوم ناپا جاسکتا ہے۔

دوسرا آلہ 'رام ینتر' ہے۔ اس کا استعمال آسمان میں سیاروں، سورج اور چاند کی برابری اور زاویوں کا صحیح مقام جاننے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے تاروں کی اونچائی اور ان کے موجودہ مقام کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

▲ یہ ہے جے پور کا 'جنتر منتر' جو راجہ جے سنگھ کے قلعے میں بنایا گیا تھا

تیسرا آلہ 'مشر ینتر' ہے جس کی تعمیر راجہ سوائی جے سنگھ کے فرزند راجہ مادھو سنگھ نے 1751 میں کرائی تھی۔ اس آلے کے ذریعے سورج کی اونچائی ناپی جاسکتی ہے۔ اس آلے کے ذریعے سال کے سب سے بڑے دن اور چھوٹے دن (21 جون اور 23 دسمبر) کو ناپا جا سکتا ہے۔ اس میں لگی نومون کی پرچھائیں زمین کی رفتار کے ساتھ چلتی ہے۔ لکیروں پر جب نومون کی پرچھائیں پڑتی ہے تو اس سے وقت کا پتہ چل جاتا ہے۔ نومون دیکھنے میں ایک معمولی لوہے کی چھڑ ہے لیکن سورج نکلتے اور ڈوبنے تک اس کی پرچھائیاں رہتی ہیں۔ پانچ ڈگری جھکی ہوئی دیوار پر لگا نومون سورج کا صحیح مقام بتاتا ہے۔ یہی نہیں دوپہر کا صحیح وقت کس شہر میں کیا ہے یہ بھی اس ینتر سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

اس کو دیکھ کر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ بچوں کو جنتر منتر دکھانا مفید ہوگا اور ایسا سوچنا غلط نہیں۔ علم فلکیات کے بارے میں کتابوں میں دی گئی بہت سی معلومات کو سمجھنا اس قدر آسان ثابت نہیں ہوتا جتنا کہ جنتر منتر کو دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ پھر اس سے علم نجوم و فلکیات میں دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر 21 جون کا دن سب سے بڑا ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس دن زمین کی حرکت حالت کیسی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ جنتر منتر کوئی معمولی یادگاری مرکز نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی مشاہدہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں عوام اور خاص طور پر بچے خلا اور زمین کے رشتے کو سمجھنے کے لیے آتے ہیں جو یہاں موجود خاص قسم کے نجوم کے ینتروں کی مدد سے جانا جاسکتا ہے۔

یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شروع میں اسے 'ینتر منتر' کے نام سے پکارا گیا تھا جو بعد میں 'جنتر منتر' ہو گیا۔ عالمی ادارے یونیسکو کی جانب سے 2009 میں یہاں 'عالمی یوم علم نجوم' یعنی آسٹرو

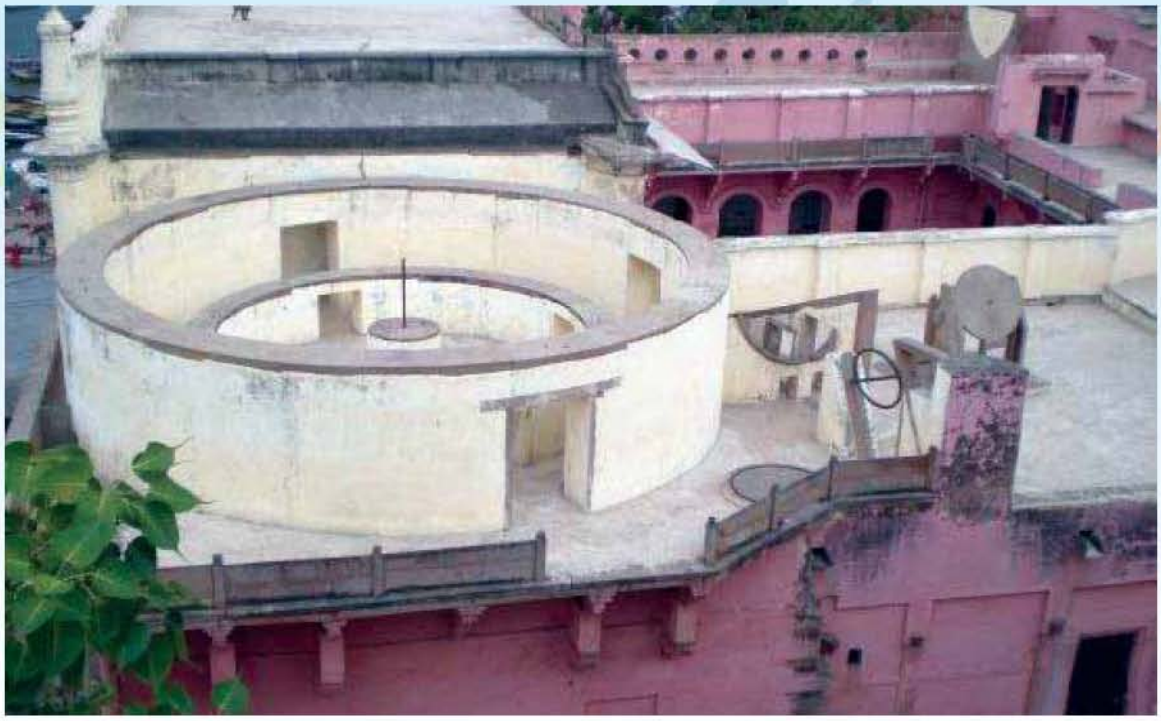

▲وارانسی کا 'جنتر منتر' جو ایک عمارت کی چھت پر بنایا گیا

نومی کا انٹرنیشنل ڈے منایا گیا تھا۔ اس سے علم فلکیات کے میدان میں اس عمارت کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ 'جنتر منتر' کی عمارت کا رنگ پہلے سفید تھا۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کا سفید رنگ بدل کر سرخ رنگ کس نے دیا۔ یہ ہماری غیر معمولی قومی میراث ہے۔ اس لیے اس کی دیکھ بھال کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے جو لوگ دیکھنے آتے ہیں انہیں اس کی عظمت کا خیال کرنا چاہیے کیونکہ یہاں تعمیر کیے گئے علم نجوم کے آلات معیار کے مطابق نہیں ملتے ہیں۔ لیکن بغیر کسی اچھے ماہر کے اتنے قدیم آلات کی صحیح مرمت بھی ایک مشکل کام ہے۔ سیاحوں اور آنے والے لوگوں کے لیے ایک ایسے گائڈ کی بھی یہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ان کی اہمیت کے بارے میں لوگوں کو بتاتا رہے۔

یہاں پر تینوں اہم آلات کے ساتھ مختصر جانکاری درج ہے لیکن یہ ناکافی ہے۔ کچھ آلات ایسے ہیں جن کی سیڑھیاں اونچے ہونے کی وجہ سے بچوں کے لیے خطرناک ہوسکتی ہیں۔ اس لیے اسے دیکھنے کے دوران بچوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ قدیم کمزور آلات پر سیاحوں کے چڑھنے سے بھی ان کو نقصان پہنچتا ہے۔

جنتر منتر کو غور سے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ راجہ سوائی جے سنگھ (دوئم) کس قدر محنتی، عقل مند اور تلاش و جستجو کا شوق رکھنے والے انسان تھے۔ ان میں ایک اچھے سپاہی، اچھے سیاستداں اور شہری منصوبے تیار کرنے والے کی خوبیاں بھی تھیں۔ ایک اچھے عمارت ساز یا آرکیٹکٹ تو وہ تھے ہی۔ آنے والی نسلیں ان کا نام یاد رکھیں گی کیوں کہ ان کا کام قدیم اور جدید علم نجوم کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'جنتر منتر' صدیوں تک دنیا کو راجستھان کے اس علم دوست راجہ کی یاد دلاتا رہے گا۔ ہم بھی ان کو یاد رکھیں اور جنتر منتر کو دیکھ کر اپنا علم بڑھائیں تو یہ راجہ جے سنگھ کے لیے ہمارا سب سے اچھا خراج عقیدت ہوگا۔ □

Mr Mohd KhaleelH 51 Dr Iqbal Lane Batla House Jamiya Nagar Okhla New Delhi-110025

□ رجب علی بیگ سرور

4

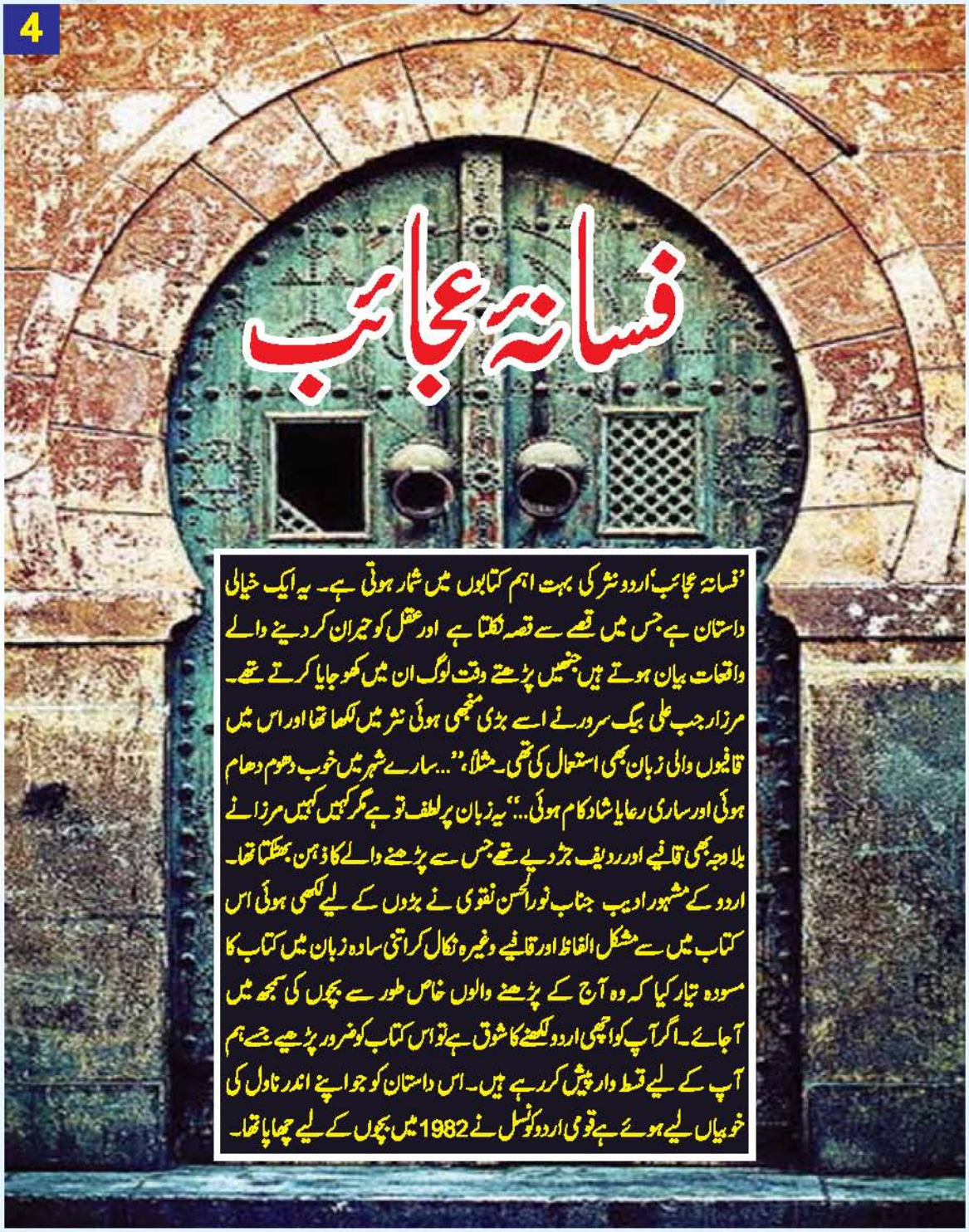

فسانۂ عجائب

'فسانۂ عجائب' اردو نثر کی بہت اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ایک خیالی داستان ہے جس میں قصے سے قصہ نکلتا ہے اور عقل کو حیران کر دینے والے واقعات بیان ہوتے ہیں جنھیں پڑھتے وقت لوگ ان میں کھو جایا کرتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اسے بڑی منجھی ہوئی نثر میں لکھا تھا اور اس میں قافیوں والی زبان بھی استعمال کی تھی۔ مثلاً: "...سارے شہر میں خوب دھوم دھام ہوئی اور ساری رعایا شاد کام ہوئی..." یہ زبان پر لطف تو ہے مگر کہیں کہیں مرزا نے بلاوجہ بھی قافیے اور ردیف جڑ دیے تھے جس سے پڑھنے والے کا ذہن بھٹکتا تھا۔ اردو کے مشہور ادیب جناب نورالحسن نقوی نے بڑوں کے لیے لکھی ہوئی اس کتاب میں سے مشکل الفاظ اور قافیے وغیرہ نکال کر اتنی سادہ زبان میں کتاب کا مسودہ تیار کیا کہ وہ آج کے پڑھنے والوں خاص طور سے بچوں کی سمجھ میں آجائے۔ اگر آپ کو اچھی اردو لکھنے کا شوق ہے تو اس کتاب کو ضرور پڑھیے جسے ہم آپ کے لیے قسط وار پیش کر رہے ہیں۔ اس داستان کو جو اپنے اندر ناول کی خوبیاں لیے ہوئے ہے قومی اردو کونسل نے 1982 میں بچوں کے لیے چھاپا تھا۔

اس داستان میں شہزادہ جان عالم اور ملک زر نگار کی شہزادی انجمن آرا کی محبت کا قصہ بنیادی قصہ ہے جس میں سے کئی اور دل چسپ قصے اور پھر ان میں سے بھی کئی قصے پھوٹ نکلتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ داستانیں لکھی گئیں وہ فرصت کا زمانہ تھا اور لوگوں کے پاس انہیں پڑھنے سننے کے لیے خوب وقت ہوتا تھا۔

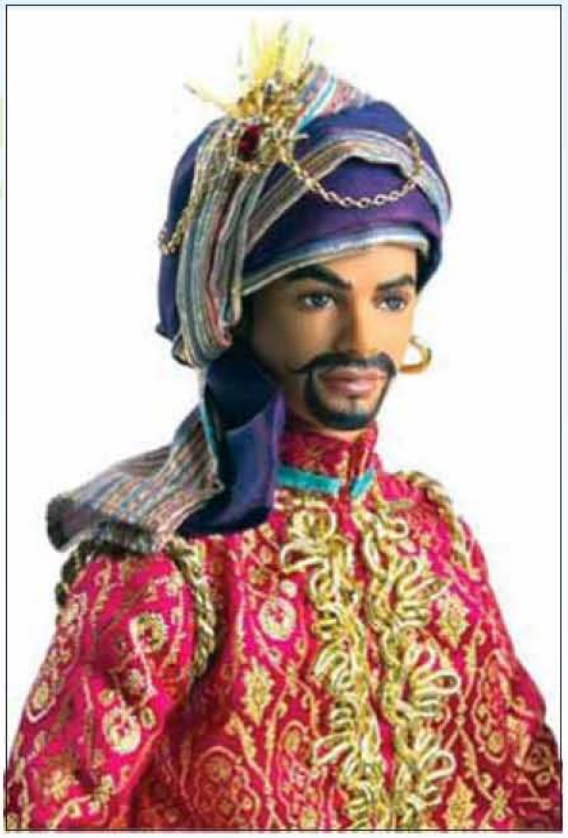

اب تک آپ نے پڑھا : کسی زمانے میں، ملک ختن میں ایک بادشاہ تھا جس کا نام تھا فیروز بخت۔ شہزادہ جان عالم اس کی اکلوتی اولاد تھا۔ ایک دن شہزادے نے ایک طوطا باز ر سے خریدا جو بولتا تھا۔ یہ طوطا بڑا عقل مند اور عالم تھا۔ وہ دنیا بھر کی باتیں شہزادے کو بتایا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ملک زرنگار کی ملکہ انجمن آرا کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ اتنی خوب صورت ہے کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ نوجوان شہزادہ بنا دیکھے ہی ملکہ انجمن آرا سے محبت کرنے لگا اور اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ راستے میں اسے طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مقام پر وہ غلطی سے ایک جادوگرنی کے جال میں پھنس گیا جو اسے اپنے محل لے گئی اور کہنے لگی کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن جان عالم نے انکار کردیا اور اس کی طلسمی قید سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ آخروہ جادوگرنی کے طلسم توڑ کر قید سے نکل آیا۔ راستے میں اسے ملکہ مہر نگار اپنی خواصوں کے ساتھ ملی اور اپنے گھر لے گئی۔ ملکہ نے جان عالم کا پورا قصہ سن کر اپنے والد سے ملا یا جو بادشاہت چھوڑ کر عبادت گزار بن چکے تھے۔ انہوں نے جان عالم کو بہت سی دعاؤں کے ساتھ ایک لوح بھی دی جو دراصل خدا کے ناموں کا ایک تعویذ تھی اور جادو توڑنے کا اثر رکھتی تھی۔ مہر نگار اوراس کے بزرگ والد سے رخصت ہو کر جان عالم ، انجمن آرا سے ملنے اس کے ملک زرنگار کی طرف چل پڑا۔ وہاں پتہ چلا کہ انجمن آرا ایک جادوگر کی قید میں ہے اور پورا ملک سوگ میں ڈوبا ہے۔ یہ سنتے ہی شہزادہ جادوگر سے لڑنے چلا اور کامیاب رہا۔ انجمن آرا کو پہلی بار دیکھتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ اب آگے پڑھیے :

آخر شرم روکتی رہی لیکن شہزادی نے جان عالم کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ چہرے سے گرد پونچھی، اس بے چاری نے کب کسی کو غش کھاتے دیکھا تھا، گھبرا کے رو پڑی۔ جان عالم کے منہ پر آنسو کی بوندیں ٹپکیں تو ہوش آیا۔ آنکھیں کھول دیں۔ انجمن آرا نے شرما کے اپنا گھٹنا سرکایا۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے شہزادی کا چہرہ دیکھا اور بولا کہ ہماری ہوشیاری سے تو بے ہوشی اچھی تھی۔

ادھر تو جان عالم اور انجمن آرا میں نوک جھونک ہو رہی تھی ادھر شاہی ہرکارے پل پل کی خبریں قلعے میں پہنچا رہے تھے۔ بادشاہ نے سنا کہ بیٹی جادوگر سے آزاد ہوگئی تو باغ باغ ہوگیا۔ فوراً درباریوں کے ساتھ روانہ ہوا اور ایک سکھپال (ایک طرح کی پالکی) جو شہزادی کی سواری کے لائق تھا ساتھ لے لیا۔

بات کی بات میں بادشاہ اپنی بیٹی کے پاس آپہنچا۔ کہاریاں بادشاہ کا

تخت قریب لائیں، انجمن آرا منھ چھپا کر بیٹھ گئی۔ جان عالم چپ چاپ پاس سے ہٹ گیا۔ بادشاہ تخت سے اترا۔ سب سے پہلے جان عالم کو گلے سے لگایا۔ اس کی بے مثال بہادری کی تعریف کی اور بہت سی دعائیں دیں۔ پھر بیٹی کو چھاتی سے لگا کے سکھپال میں سوار کیا۔ شہزادے کو اپنے برابر تخت پر بٹھالیا۔ اب سلطنت کے خیر خواہ اور ملازمان سرکار نزدیک آئے، انھوں نے منوں سونا چاندی تخت اور سکھپال پر سے نثار کیے۔ اس قدر اشرفی روپیہ صدقے ہوا کہ آج تک جو محتاج مسافر ادھر جاتے ہیں چاندی سونا پاتے ہیں نصیب جاگ جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر میں فوج اور نوبت نشان بلکہ سارا سامان آ جمع ہوا۔ اہل شہر نے یہ خبر سنی تو خوشی سے باولے ہوگئے، خوشی کے شادیانے بجاتے، مبارک سلامت کا غل مچاتے ہوئے جمع ہوگئے۔ سب کی عید ہوگئی، شہر کی رونق پھر سے لوٹ آئی، محل میں خوشی کی محفل گرم ہوگئی۔

انجمن آرا کی ماں گرد پھرتی تھی، بار بار زمین پر سجدے کرتی تھی، کہتی تھی "اللہ نے جان عالم کی بدولت ہارے دن پھیرے۔" بادشاہ کہتا تھا "اے خدائے پاک! جس طرح ہماری بیٹی اور ہم ملے سارے بچھڑے تیرے کرم سے اسی طرح ملیں، سب کی مرادوں کے پھول کھلیں۔ سب جان عالم کی بہادری کی داد دیتے تھے کہ یہ ناممکن کام اسی کے دم سے ممکن ہوا۔"

انجمن آرا جب یہ نام سنتی، خوشی سے کھل جاتی مگر لوگوں کو سنانے کو کہتی "صاحبو! بار بار یہ کیا کہتے ہو، میرا مقدر سیدھا نہ ہوتا تو وہ کون تھا جو میرے دن پھیرتا۔"

شہزادی کی سہیلیاں تاڑ گئیں کہ دل میں کچھ اور ہے زبان پر کچھ اور۔ یہ ساری باتیں صرف سنانے کے لیے ہیں۔ جب انجمن آرا کی ماں پاس سے سرکی تو انہیں چھیڑ چھاڑ کرنے کا موقع مل گیا۔ پاس آ کے بولیں "ہے ہے، ہم تو تیری جدائی میں تڑپتے تھے، زندگی کے دن بھرتے اور گھڑیاں گنتے تھے۔ یہ صورت اللہ نے دکھائی بلکہ یوں کہو کہ جان عالم کی جوتیوں کے صدقے نظر آئی۔ جیسے خدا نے ہم سب کی خواہش پوری کی اسی طرح جان عالم کے جی کی مراد بھی خدا پوری کرے۔"

انجمن آرا غصے کی شکل بنا، تیوری چڑھا کے کہنے لگی "شاید تم سب کی شامت آئی ہے جو یہ بک بک مچائی ہے۔ تم نے خوب میری چڑھ نکالی۔ خدا جانے یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اسے تو کیا کوسوں، وہ بے چارہ تو مسافر ہے۔ جی میں آتا ہے ان کا منہ نوچ لوں جو مجھے تنگ کر رہے ہیں۔ اب کوئی مجھے چھیڑے گا تو میں رو دوں گی اور اپنا سر پیٹ لوں گی۔" یہ کہہ کے مسکرا دی۔

شہر میں منادی ہوگئی کہ خوشیاں مناؤ، سارے شہر کو دلہن کی طرح سجاؤ، ناچ رنگ کی خوب خوب محفلیں جماؤ۔ سلطنت کے خیر خواہ نظریں لے کے حاضر ہوئے۔ شاہی ملازم انعام سے مالا مال ہوئے۔ غرض گھر گھر عید ہوگئی۔ خوب خوب نذریں نیازیں ہوئیں۔ محتاجوں نے ایسی خیرات پائی کہ خواب میں اتنا روپیہ پیسہ اور سونا چاندی نہ دیکھا ہوگا۔ ہر طرف مبارک سلامت کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

ناچنے والیاں ناچتی تھیں اور گانے والیاں یہ گاتی تھیں۔

شادی وجشن سزاوار مبارک ہووے
آج شہزادی کا دیدار مبارک ہووے
وہ بھی دن آئے جو سہرا بندھے سر پر اس کے
سب خوشی سے کہیں ہر بار مبارک ہووے
بعد شادی کے خدا دے کوئی فرزندِ رشید
ہم کہیں آکے یہ دل دار مبارک ہووے

شہزادے کی انجمن آرا سے شادی

آخر جشن سے سب کو فرصت ہوئی۔ ایک دن بادشاہ محل سرا میں آرام کرتا تھا۔ بیوی سے ادھر ادھر کی بات چل نکلی۔ بولا "یہ جان عالم کا احسان جو ہم سب پر ہے اس سے تو سبھی واقف ہیں۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ انجمن آرا کے حسن کا ذکر سن کے بغیر دیکھے اس پر فریفتہ ہوگیا۔ سلطنت کھو کے اور اپنا چین آرام تج کے یہاں تک پہنچا۔ یہاں آکے جو کام انجام دیا اسے ہم سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔ کیسے زبردست اور موذی جادوگر کو شکست دی۔ اس کے طلسم کی دھجیاں اڑادیں۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اسے قید سے چھڑایا۔ اس کے علاوہ صورت شکل ایسی کہ آج تک ایسا نہ دیکھا اور نہ سنا۔ شہزادہ ایسے بڑے ملک کا دور دور اس کا شہرہ ہے۔ خاندان اعلیٰ اور عزت والا۔ مطلب یہ کہ کسی چیز کی کوئی کمی نہیں۔ آج کیا ہے، کل کیا ہو، مثل مشہور ہے آج کا کام کل پر نہ ٹالو۔ اب چاہئے کہ فوراً شادی کی تیاری ہو۔"

ملکہ نے کہا "جو بات آپ کے خیال میں آئی ہے میں بھی دل سے یہی چاہتی تھی۔"

بادشاہ نے کہا "آج انجمن آرا سے اس سلسلے میں گفتگو کرلو اور اس کی رضامندی حاصل کرکے کل سے تیاری شروع کردو۔"

بادشاہ یہ فرما کے دربار کے لیے تشریف لے گیا، ماں نے انجمن آرا کو طلب کیا، دو چار مغلانیاں (محل کی خادمائیں)، آتوں (لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے والی استانی) اور محلداریں (محل کی پہرے دار عورتیں) بھی بلائی گئیں۔ شہزادی کی بہت سی سہیلیاں بن بلائے چلی آئیں۔ ماں نے بیٹی کو گلے لگایا، پیار کیا اور یوں بات شروع کی۔ "سنو بیٹی، دنیا کے کارخانے میں یہ رسم ہے کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک بیٹی کسی کی ماں باپ کے پاس ہمیشہ نہیں رہتی، غیرت دار گھر میں جوان بیٹی ماں باپ کے لیے شرمندگی کا باعث ہوتی ہے۔ خدا اور رسول کا حکم بھی یہی ہے کہ جوان بیٹی کو بٹھا نہ رکھو۔ جتنے جلدی بن پڑے شادی کردو۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ایک شخص نے تمہارے واسطے گھر چھوڑا۔ سلطنت سے منہ موڑا، ہر آفت کا مردوں کی طرح سامنا کیا، جی پر کھیل گیا، کیا بلائیں جھیل گیا، جب کہیں تم نے ہم کو دیکھا، ہم نے تمہاری صورت دیکھی، خدا نے شکل ایسی دی ہے کہ سارا شہر اس پر نثار ہے۔"

انجمن آرا نے یہ سن کر سر جھکالیا، رونے لگی، کہا "اماں حضور!

صورت شکل کا کیا ذکر کرتی ہو، یہ اللہ کی قدرت ہے، کسی کو بگاڑا، جہاں پھول ہے وہاں کانٹا بھی ہے، برے نہ ہوں تو اچھے اچھے نظر نہ آئیں، احسان سے دب کے یہ بات کہتی ہو تو دنیا کا کارخانہ اسی طرح چلتا ہے۔ ایک کا کام دوسرے سے ہوتا آیا ہے۔ یہ شخص نہ آتا اور میری قسمت میں قید سے رہائی ہوتی تو کوئی نہ کوئی سامان ہو جاتا۔ کوئی اور اللہ کا بندہ آ کے یہ کام انجام دیتا۔ میری قسمت کم بخت بری ہے۔ ایک مصیبت سے چھٹرا دوسری آفت میں پھنسایا۔ اپنے بیگانوں کے طعنے سننے پڑے کہ یہ آیا، مجھے قید سے چھڑایا، خدا جانے وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، اپنے تئیں شہزادہ بنایا ہے، میں آپ کی لونڈی ہوں، ہر طرح فرماں بردار ہوں، اگر کنویں میں جھونک دو تو گر پڑوں، اف نہ کروں۔ مگر آپ اس کی شکل پر ریجھ کر اور اس کی محنت پر نظر کر کے یہ رشتہ کرنا چاہتی ہیں تو میں راضی نہیں ہوں۔ اگر اس کی محنت کا بدلہ دینا چاہتی ہیں تو روپیہ، اشرفی، جاگیر عنایت کیجیے کہ اس کا کام ہو اور آپ کا نام ہو۔"

بیٹی کی یہ باتیں سن کر ماں بہت ہنسی کہا "شاباش بیٹی، تم نے اس کی جاں نثاری کی اچھی قدر کی۔ وہ تمہارے انعام کا محتاج ہے؟ اری نادان وہ تو خود تخت و تاج کا وارث ہے۔"

شہزادی کی سہیلیاں بھی ہنسیں کہ انجمن آرا نے شہزادے کو مزدور ٹھہرایا۔ بوڑھی تجربے کار آتوں اور مغلانیاں بھی حاضر تھیں۔ وہ بولیں "بیٹی قربان جائیں، ماں باپ کا کہا نہ ماننے سے خدا اور رسول ناخوش ہوتے ہیں۔ انکار مناسب نہیں۔ اور خدانخواستہ یہ کیا تمہاری دشمن ہیں جو بے دیکھے بھالے کسی کے کہنے سننے سے تمہیں کسی راہ چلتے کے حوالے کر دیں گی۔ انسان اپنی زندگی میں ہر روز عقل سیکھتا ہے، اونچ نیچ سمجھتا ہے، اب تم خیر سے سیانی ہو گئیں مگر ابھی تک بچپنے کی باتیں کرتی ہو، کھیلنے کودنے کے سوا کچھ نہیں جانتیں۔"

انجمن آرا نے جواب نہیں دیا۔ سر زانو پر رکھ لیا لیکن وہ جو امیر زادیاں اس کی دوست اور ہم نشیں تھیں، جن سے اس بات کے روز مشورے رہتے تھے، بولیں "ہے ہے لوگو! تمہیں کیا ہوا ہے، آتوں جی صاحب، بے ادبی معاف، آپ نے دھوپ میں جو ٹھنڈا (سر کے بال) سفید کیا ہے، خیریت

صاحبو، دلہن سے صاف صاف کہلوانا چاہتے ہو، دنیا کی شرم و حیا گوڑی کیا اڑ گئی، بھلا ماں باپ کا کہا کسی نے ٹالا ہے، جو یہ ٹالیں گی۔ مثل مشہور ہے خاموشی آدھی رضامندی، بڑوں کے آگے اور کہنا کیا۔"

یہ سن کر پرانی آتوں نے جس نے انجمن آرا کو پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا تھا مبارکباد کہہ کے انجمن آرا کی ماں کو نذر دی۔ محل میں قہقہے مچے، شہزادی رونے لگی، سارے درباریوں نے نذریں پیش کیں۔ نوبت نقارے بجنے لگے، توپیں چھٹنے لگیں، ہر طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آنے لگیں۔

شادی کی تیاریوں کا وقت آیا تو بادشاہ نے وزیر اعظم سے فرمایا کہ "شہزادہ مسافر ہے، ہمارا مہمان ہے، تم ہر طرح کے امتحان کی صلاحیت رکھتے ہو، اس کی طرف سے سارا بندوبست تم کرو۔"

وزیر آداب بجالایا، بادشاہ نے اسے ہاتھی پالکی سے سرفراز کیا۔

رمّال، نجومی، پنڈت دربار میں بلائے گئے، انھوں نے حساب

لگا کے مبارک وقت کا پتہ لگایا تا کہ شادی کا دن اور وقت طے کیا جائے۔ آخر سب کچھ طے ہوگیا۔ شبھ گھڑی، مانجھے کا جوڑا دلہن کے گھر سے چلا، ہزاروں پکھراج کی کشتیوں میں زعفرانی جوڑے لگائے گئے۔ سنہرے خوانوں میں پینڈیاں (شادی میں جہیز کی بجائے دی جانے والی رقمیں) سجیں، میووں کے طشت تیار ہوئے، دودھ کے واسطے اشرفیوں کے گیارہ توڑے، طلائی چوکی، جواہر جڑاز مرد نگار کٹورا، بٹنا ملنے کا کنگنا، بیل بوٹوں والی ملتانی کی لنگی، کنٹروں میں بھرا ہوا کشمیر کا عطر اور ابٹن محمد شاہی ارگجا اور طرح طرح کی چیزیں سلیقے سے سجائی گئیں۔ یہ سامان لے کے جلوس روانہ ہوا۔ جلوس میں ہاتھی اور گھوڑے شامل تھے۔ زنانی سواریاں سکھپالوں اور چنڈولوں میں سوار تھیں۔ ان سواریوں کو زرق برق پہنے کہاریاں چھم چھم کرتی لیے جاتی تھیں۔ جلوس کے آگے نوبت نقارہ بجتا تھا۔

یہ جلوس جن بازاروں اور سڑکوں سے گزرا وہ خوشبوؤں میں بس گئے، وہاں دلہن اور دولہا نے مانجھے کے جوڑے پہنے، چاروں طرف منادی ہوگئی کہ سب رنگین لباس جس سے خوشبو برستی ہو وہ پہنیں۔ جو سفید پوش نظر آئے گا اپنے خون سے سرخ ہوگا۔ یعنی گردن ماری جائے گی۔ خود بادشاہ نے رنگین لباس پہنا اور رنگ کھیلنے لگا۔ ساری رعایا ہولی کی کیفیت بھول گئی۔ سارے شہر میں سرخ اور زرد نالے بہہ گئے۔ گلی کوچوں میں عبیر اور گلابی کے ڈھیر لگ گئے۔ اعلان ہوا کہ آج سے چوتھی تک سب لوگ کاروبار بند کردیں۔ اپنے اپنے گھر میں جشن کریں، ناچ دیکھیں، جس چیز کی ضرورت ہو وہ سرکار سے لیں۔ ہندوؤں میں پوری، کچوری، مٹھائی، اچار تقسیم ہوا۔ مسلمانوں کو پلاؤ، قلیہ، زردہ، قورمہ، شیرمال، فیرنی کباب عطا ہوئے، صوبے داروں کا حکم بھیجا گیا کہ چاروں طرف دو کوس کے فاصلے سے باورچی اور حلوائی کھانا مٹھائی تیار کیے سڑکوں پر بیٹھے رہیں کہ اس عرصے میں جو مسافر گزرے بھوکا نہ جائے۔ دور دور شادی کا شہرہ پہنچ جائے۔

دو منزل چار منزل بلکہ دس دس بیس بیس دن کا سفر طے کر کے تماش بین بے فکرے سیر دیکھنے کو آئے۔ ساچق (برات سے ایک دن پہلے دولہا کے گھر سے دولہن کے لیے مٹھائی بھیجنے کی رسم) کا دن تھا۔ سارے سامان کی تفصیل بیان کرنی ممکن نہیں، پھر بھی کچھ چیزوں کا حال لکھا جاتا ہے۔ پچاس ہزار چوگھڑے سونے چاندی کے بنے، سب تُقل اور میوے سے لبالب بھرے، ایک لاکھ خوان، پچاس ہزار میں مصری کے کوزے باقی میں میوے اور قند کی جھڑیاں۔ سونے کی مکی جو دہی سے بھری تھی اور اس کے گلے میں مچھلیاں ناڑے سے بندھی تھیں۔ آرائش کے بے شمار تخت جن کی گنتی ممکن نہیں۔ آتش بازی کے ٹوکرے قطار در قطار، جھاڑ، درخت میوہ دار ہزار دو ہزار، اور اس

کے علاوہ اتنا ساز وسامان تھا کہ کسی نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔

اس انداز سے ساچق گئی۔ مہندی کی شب ہوئی۔ وزیر نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، نارنول کی ہزار ہا من مہندی منگائی تھی، اس مہندی کا کمال یہ تھا کہ جو ایک بار لگالے ساری زندگی اس کا ہاتھ لال رہے۔ اسے جڑاؤں سینیوں میں سجا کے ان پر موی اور کافوری شمعیں جلادی گئی تھیں۔ ملیدے کے خوانوں پر غضب کا حسن وشباب تھا۔ اس جلوس کے دونوں طرف آتش بازی چھوٹتی جاتی تھی۔

برات کی رات کا حال بھی سننے کے قابل ہے۔ دیوان خاص سے دلہن کا مکان پانچ کوس کے فاصلے پر تھا، دونوں طرف آدمی کے قد سے دوگنے سو سوبتی والے بلور کے جھاڑ پانچ پانچ گز کے فاصلے پر روشن تھے۔ دس دس گز کے فاصلے پر سونے اور چاندی کے پنج، شاخے جلتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نوبت نقارے بجتے تھے اور رنگین شامیانوں کے تلے ناچ گانا ہوتا تھا۔

آخر دولہا ہاتھی پر سوار ہوا، چاروں طرف شادیانے بجنے لگے، شہنائیاں بج اٹھیں، سواروں کے رسالے جلوس کے ساتھ ساتھ تھے، ہزار بارہ سو تخت رواں ساتھ تھے جن پر ناچ ہوتا جاتا تھا، برچھے والے، بان دار اور روشن چوکی والے ہمراہ تھے، بادشاہ بارہ ہزار ہاتھیوں کے ساتھ بارات کے پیچھے آتا تھا، امیر اور وزیر اس کے گرد وپیش تھے، انجمن آرا کا بھائی شہ بالا بنا تھا۔

پہر رات رہے برات دلہن کے دروازے پر پہنچی، ماما اصیلیں دوڑیں، پانی کا طشت ہاتھی کے پاؤں تلے پھینکا، ناچ گانے کی محفلیں جم گئیں، صبح ہونے کو تھی کہ قاضی کو طلب کیا گیا، اس نے نکاح پڑھایا، کئی سلطنتوں کے خراج پر مہر بندھا، سارے گویے ایک سر میں مبارک بادگانے لگے، بادشاہ نے انھیں کئی لاکھ روپے انعام میں دیے۔

دولہا زنانے میں طلب ہوا، وہاں رسمیں ہونے لگیں، آرسی مصحف کی رسم ادا ہوئی، سورۂ اخلاص کھول کے سامنے رکھی، ڈومنیاں سہاگ گانے لگیں، دلہن کی ہمجولیاں دولہا سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگیں، کوئی دلہن کی جوتی دولہا کے کندھے سے چھوا گئی، کسی نے دولہا کے جوتے چھپا

کے جوتا چھپائی مانگی، رخصت کا وقت آیا تو جان عالم نے انجمن آرا کو گود میں اٹھا کے سکھپال میں سوار کیا۔ سب کا دل بھر آیا، بادشاہ نے ملک، سلطنت، خزانہ سبھی کچھ جہیز میں دے دیا۔ جان عالم کی خوشیوں کا کچھ ٹھکانا نہ تھا، ادھر دلہن کے گھر میں کہرام تھا، ہر ایک کی آنکھ میں آنسو تھے۔

شادی کا جلوس بڑے کرّ وفر سے روانہ ہوا۔ باجوں کا شور آسمان تک پہنچتا تھا۔ سارے راستے دولہا دولہن پر سے سونا چاندی نثار کیا گیا۔ یہ جلوس چوک سے گزر کے دیوان خاص میں داخل ہوا۔ جو رسمیں یہاں کی تھیں، ہونے لگیں، بکرا ذبح کیا انگوٹھے میں خون لگا دیا، پھر کھیر کھلا کے رسموں سے فرصت پائی۔ رات کو شہزادے نے شہزادی کو ساری کہانی سنائی کہ کس طرح طوطے کی زبان سے انجمن آرا کے حسن کا بیان سنا، کس طرح بے دیکھے اس پر فدا ہوا، وزیرزادے اور طوطے کو لے کر سفر پر روانہ ہوا، ہرن کو دیکھ کے اس کا پیچھا کیا تو تے اور وزیرزادے سے بچھڑا۔ طلسم میں پھنسا، مہینوں جادوگرنی کی قید میں

رہا، پھر کس کس طرح قید سے رہائی پائی، ملکہ مہر نگار سے ملاقات ہوئی، شہزادی نے جادوگرنی پر تو افسوس کیا، مگر مہر نگار کی ملاقات کی بات سنی تو دکھی صورت بنائی، تیوری چڑھائی، پھر شہزادے نے جادوگر سے لڑنے اور انجمن آرا کو اس سے نجات دلانے کا حال تفصیل سے سنایا۔

صبح کو چوتھی کی رسم کے بعد بادشاہ نے شہزادے اور شہزادی کو ایک خوب صورت باغ رہنے کو عطا کیا۔ باغ کیا تھا پورا راحت کدہ تھا۔ کون سا عیش و آرام تھا جو اس باغ میں موجود نہ تھا۔ دونوں باغ میں رہنے لگے۔

جان عالم کو ادھر جتنے عیش تھے ملکہ مہر نگار کو ادھر اتنی ہی تکلیف تھی، ہر وقت شہزادے کو یاد کرتی تھی اور اس سے ملاقات کی دعائیں مانگتی تھی۔ جس جگہ شہزادے سے ملاقات ہوئی تھی اکثر وہاں جاتی اور پہروں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اس کی سہیلیاں اس کی حالت پر ترس کھاتیں اور خدا سے دعا کرتی تھیں کہ اے اللہ اس مصیبت کی ماری کی بگڑی بنادے۔

کہتے ہیں محبت سچی ہو تو اس میں اثر ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایسا ہوا کہ شہزادے کا وہاں جی گھبرانے لگا، اپنا وطن یاد آنے لگا، اکثر ایسا ہوتا کہ ملکہ مہر نگار کی وفائیں یاد آتیں اور پہروں جان عالم کو ستاتیں۔ ایک دن اچانک خیال آیا کہ خدا جانے مہر نگار کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کیا خبر جیتی بھی ہے یا ہمارے فراق میں مر گئی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ شہزادے کا دل بری طرح گھبرانے لگا۔ انجمن آرا سے بولا ''اب وطن اور دوستوں و عزیزوں کی یاد بہت ستاتی ہے، آج بادشاہ سلامت سے وطن جانے کی اجازت چاہوں گا۔'' یہ سن کے انجمن آرا کا دل دھک سے رہ گیا، ماں باپ اور وطن سے چھوٹنے کا خیال ستانے لگا مگر شوہر کی فرماں بردار تھی اور اس نے جو تکلیفیں اٹھائی تھیں ان کی قدر کرتی تھی، بولی ''میرا بھی جی چاہتا ہے کہ یہاں سے قدم نکالوں اور کوہ و بیاباں کی سیر کروں۔''

صبح کو شہزادہ روز کی طرح دربار میں حاضر ہوا اور دل کی بات زبان پر لایا۔ بادشاہ سے اپنے وطن جانے کی اجازت مانگی۔ بادشاہ نے رخصت کی بات سنی تو بہت رنجیدہ ہوا۔ بولا ''اے عزیز! یہ رخصت کی بات تو نے کیا کہی، میرے دل میں ایسی بات سننے کی طاقت کہاں، سیر و شکار کی خواہش ہے تو یہاں کیا کمی ہے، ہمارا علاقہ تو سیر و شکار اور آب و ہوا کے لیے دور دور مشہور ہے۔ چاروں طرف کے لوگ سیر کو آتے ہیں، خزانہ موجود ہے، فوج حاضر ہے، اطمینان سے جدھر جی چاہے جاؤ اور سیر کر کے جی بہلا آؤ۔''

جان عالم نے سر جھکا کے اور بہت ادب سے عرض کیا ''اے لائق احترام شہریار! یہ ناچیز مشکل سے برس دن یہاں رہا، اتنی کم مدت میں آپ کو مجھ سے وہ محبت ہوگئی کہ ملک، مال بلکہ جان سے زیادہ مجھے عزیز رکھتے ہیں، ذرا سوچئے وہ ماں باپ جنہوں نے بڑی محنتوں سے مجھے پالا، دن کو دن رات کو رات نہ جانا، میرے لیے کتنی منتیں مانیں، انھوں نے اتنے دنوں سے مجھے دیکھا تک نہیں بلکہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اب تک جیتا ہوں یا مر گیا، میری جدائی سے ان پر کتنے صدمے گزرتے ہوں گے۔ ان بے سہاروں کا خیال کیجئے اور مجھے وطن جانے کی اجازت دیجئے۔ زندگی ہے تو پھر کبھی حاضر ہوں گا۔''

بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ اب کسی طرح روکنے والا نہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے بولا ''خیر بابا جیسی خدا کی مرضی مگر سفر کی تیاری کو کم سے کم چالیس دن چاہئیں۔'' دن کے دن یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ شہزادے شہزادی کا سفر قریب ہے۔

دونوں کے جانے پر کیسا سوگ ہوا اور ملکہ مہر نگار کے محل میں کیا پیش آیا یہ پڑھیے اگلی قسط میں!

کامیابی کا راز

سالانہ امتحانات کے نتیجے کا اعلان ہوا تو ہمیشہ کی طرح افسر نے پہلی اور اکبر نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ہر مرتبہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ اکبر دن رات پڑھتا تھا، محنت کرتا تھا، امتحانوں کے دنوں میں اسے نہ تو کھانے کا ہوش رہتا نہ پہننے کا۔ بعض اوقات تو رات رات بھر جاگ کر پڑھتا۔ اس کے باوجود اس کی دوسری پوزیشن آتی تھی۔ دوسری طرف افسر پڑھائی کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتا اور سیر و تفریح بھی خوب کرتا۔ اس کے باوجود ہمیشہ اوّل پوزیشن حاصل کرتا۔

اکبر کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ وہ افسر سے پوچھے کہ آخر اس کے اوّل آنے کا راز کیا ہے۔ آخر ایک دن اسے موقع مل گیا۔ اسے ایک کتاب کی ضرورت تھی، جو اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ افسر کے پاس تھی۔ وہ کتاب لینے اس کے گھر گیا تو باتوں باتوں میں اکبر نے افسر سے کہا۔

''یار میں تمہارے مقابلہ میں زیادہ پڑھتا ہوں۔ زیادہ محنت کرتا ہوں۔ مگر میری ہمیشہ دوسری پوزیشن آتی ہے اور تمہاری اوّل، آخر تمہاری اس کامیابی کا راز کیا ہے''

افسر نے مسکرا کر اسے دیکھا اور جواب دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ تم جو بھی پڑھتے ہو، سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ جو کچھ کتاب میں لکھا ہوتا ہے، اسے ویسے ہی یاد کر لیتے ہو۔ یا صرف وقتی طور پر یاد کرتے ہو جسے طوطے کی طرح رٹنا کہتے ہیں۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں۔'' افسر نے پوچھا۔

''ہاں تمہاری بات درست ہے۔'' اکبر نے جواب دیا۔

''جب کہ میں ایسے نہیں پڑھتا۔'' افسر نے کہا۔

''تمہارے پڑھنے کا طریقہ کیا ہے؟'' اکبر نے سوال کیا۔

''میں تم سے کم پڑھتا ہوں پھر جو بھی پڑھتا ہوں سمجھ کر پڑھتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ جو بھی لکھوں اپنے لفظوں میں لکھوں۔ میری کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں ہر کام میں سوچ سمجھ کر کرتا ہوں میری رائے ہے کہ ہر کام کا ایک وقت طے ہونا چاہیے۔ باقاعدہ ایک ٹیبل بنا لیا جائے اور اسی کے مطابق پڑھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ہر وقت بس پڑھتے رہو اور کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہے۔ یا راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھا جائے جس سے صحت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ تم تو جانتے ہو۔ میں سبھی ایکٹی وٹیز میں حصہ لیتا ہوں۔ سبھی کھیل کھیلتا ہوں۔ مگر یہ بھی ٹھیک نہیں سارا وقت کھیل میں ہی نکل جائے۔ میں نے پڑھنے اور کھیلنے کا ٹائم ٹیبل بنا لیا ہے اور اسی کے حساب سے ہر کام کرتا ہوں۔''

اکبر اس کی بات سن کر بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو دوست، تمہاری باتیں دل کو لگتی ہیں، اب میں بھی ان پر عمل کروں گا۔'' اکبر نے کتاب لی اور افسر کو خدا حافظ کہہ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ □

تحریر: محمد کیف عبدالرازق جماعت نہم اقرا پبلک اردو ہائی اسکول، جلگاؤں

ڈرائنگ: عمرین عبداللہ درجہ دوم، آئیڈیل اسکول، پودائی، ممبئی ◄

■ ادارہ

یہ مزے مزے کی حکائتیں...

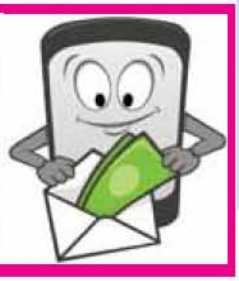

♦ ٹیچر: بڑے ہو کر تم کیا کرو گے۔

اسٹوڈنٹ: شادی

ٹیچر: نہیں۔ میرا مطلب ہے تم کیا بنو گے؟

اسٹوڈنٹ: دولہا

ٹیچر: نہیں بیٹے میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ بڑے ہو کر تم زندگی میں کیا حاصل کرو گے؟

اسٹوڈنٹ: دولہن

ٹیچر: اوہو، بھئی سوال ہے کہ بڑے ہو کر اپنے ممی پاپا کے لیے کیا کرو گے؟

اسٹوڈنٹ: بہولاؤں گا

ٹیچر: ابے بے وقوف، یہ بتاؤ کہ تمھارے باپ تم سے کیا چاہتے ہیں؟

اسٹوڈنٹ: پوتا

ٹیچر: (سر پیٹ کر) یا خدا!! ابے حرام خور، یہ بتا کہ زندگی کا کیا مقصد ہے؟

اسٹوڈنٹ: ہم دو، ہمارے دو...

فیض میسی، صوفی پورہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

♦ احمد: تمھارے بال کیوں گر رہے ہیں امجد؟

امجد: فکر سے

احمد: فکر کس بات کی؟

امجد: بال گرنے کی

زیبا

♦ استاد: بیٹا! کیا تم رات کو اللہ میاں کا شکر ادا کر کے سوتے ہو؟

شاگرد: میں تو نہیں البتہ میری امّی شکر ادا کر دیتی ہیں کہ یا اللہ تیرا شکر ہے، منّا سو گیا!

صادقہ تبسم، مالیگاؤں

♦ لڑکا برقعے والی سے: جہاں شربت وہاں فالودہ۔ کیسی ہو میری خالدہ؟

برقعے والی: نہ شربت نہ فالودہ۔ غور سے دیکھ بے غیرت، میں ہوں تیری والدہ!

عامر طلحہ، بلڈھانا

♦ دنیا والو...

...

...

کچھ نہیں، اپنا کام کرو!

♦ دوستی کے رستے بہت لمبے ہوتے ہیں

پتہ نہیں کہاں تک چلیں گے

دو قدم آپ چلنا، دو قدم ہم چلیں گے

بعد میں آٹو کر لیں گے

♦ ایک ضروری میسج:

اگر کبھی ٹوٹ کر بکھرنا چاہو تو...

مجھے یاد کر لینا

میرے پاس پانچ روپے والی گلیو اسٹک بے کار پڑی ہے

♦ تم صدا یوں ہی ہنستے رہو

مسکراتے رہو

کھلکھلاتے رہو

میرا کیا ہے!

لوگ تمھیں ہی پاگل سمجھیں گے

عندلیب شاداں، ناندیڑ، مہاراشٹر

♦ بیوی: اف! گرمی سے میرا دماغ جل اٹھا ہے

شوہر: تبھی تو میں سوچ رہا تھا، یہ بھوسا جلنے کی بو کہاں سے آ رہی ہے!

میر یوسف احسان علی

♦ ٹیچر: چاند پر پہلا قدم کس نے رکھا تھا؟

ایک اسٹوڈنٹ: سر، نیل آرم اسٹرانگ نے

ٹیچر: اور دوسرا؟

اسٹوڈنٹ: وہ بھی اسی نے رکھا۔ وہ کوئی لنگڑا تھوڑا ہی تھا؟

نزہت فاطمہ، جلگاؤں، مہاراشٹر

♦ ایک بوڑھے نے اخبار میں اشتہار دیا، رشتہ چاہیے۔

کسی نے جواب میں لکھا:

اس عمر میں رشتے نہیں فرشتے آتے ہیں

نامعلوم

♦ چہرے کی ہنسی سے ہر غم کو مٹا دو

بہت کم بولو مگر سب کچھ بتا دو

خود نہ روٹھو اور سب کو ہنسا دو

یہی راز ہے زندگی کا، جیو اور جینا سکھا دو

کوثر پروین، مومن پورہ، ناگپور

♦ ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے ایک مسافر کی جیب میں چور نے ہاتھ ڈال دیا۔ مسافر نے گھبرا کر پوچھا، ''کیا چاہیے؟''

چور نے اطمینان سے کہا، ''کچھ نہیں۔ ذرا ماچس چاہیے تھی!''

♦ ساس کی خواہش:

لڑکی خوب صورت ہو

امیر ہو

پڑھی لکھی ہو

کم عمر ہو

گھر کے ہر کام میں ماہر ہو

لڑکی کی خواہش:

ساس فوٹو فریم میں ہو!

محمد سعد انصاری، جموریا، مغربی بنگال

♦ ڈاکٹر نے لیٹے ہوئے مریض کو دیکھ کر کہا، ''یہ مر چکا ہے۔''

مریض نے آنکھیں کھول دیں اور بولا، ''مگر میں تو زندہ ہوں!''

مریض کی بیوی نے کہا، ''چپ رہو۔ تم کیا ڈاکٹر سے زیادہ جانتے ہو؟''

سارہ یہ انصاری، ناگپور

♦ ایک آدمی بڑا سا بیگ لے کر ٹرین میں بیٹھ گیا۔ ٹی ٹی نے بیگ دیکھ کر کہا، ''اس کا ٹکٹ لینا ہوگا۔'' کوئی اور راستہ نہ پا کر اس نے ٹکٹ لے لیا اور بیگ کی طرف منھ کر کے بولا، ''بیگم باہر آ جاؤ۔ جب ٹکٹ خرید ہی لیا ہے تو بیگ کے اندر بیٹھ کر جانے کی کیا ضرورت؟

سمیّہ شاذیہ، ناندیڑ

♦ اسپتال میں ڈاکٹر نے جیسے ہی مریض کو انجکشن لگایا، مریض چلایا:

''ہائے مر گیا''

دوسرے بستر سے ایک مریض کی آواز آئی، ''خاموش! مرے ہوئے لوگ بولا نہیں کرتے۔''

♦ سپاہی نے دوڑ کر چور کو پکڑ لیا اور پوچھا، ''جلدی بتا، سونا کہاں ہے؟''

چور چاروں طرف دیکھ کر بولا، ''اتنی بڑی جگہ ہے جہاں جی چاہے سو جاؤ۔''

اطہر فاضل

♦ بیوی (پیار میں اٹھلا کر شوہر سے): کیا میرے بارے میں ایسی دو باتیں کہہ سکتے ہو جن میں سے ایک مجھے خوش کر دے اور دوسری ناراض!

شوہر: تم میری زندگی ہو... اور لعنت ہے ایسی زندگی پر!

نامعلوم

♦ سنتا نے نئی کار لی اور کار کے پیچھے لکھوایا: ساون کو آنے دو

پیچھے سے ٹرک نے ٹکر ماردی۔ اس پر لکھا تھا: آیا ساون جھوم کے!

♦ سنتا جلیبی بیچتے ہوئے آواز لگا رہا تھا: آلو لے لو آلو!

بنتا بولا: ابے جلیبی کی آواز لگا

سنتے نے کہا: چپ ہو جا یار، مکھیاں آ جائیں گی!

عابد اختر انصاری، ناگپور ♦♦

■ادارہ

▲مدھیہ پردیش کی چمبل ندی کے گھڑیالی کنارے پر ایک درخت کی آڑ سے یہ تصویر مشہور فوٹو گرافر اودین راؤ پوار کی کھینچی ہوئی ہوئی ہے جنھیں 2013 کا وائلڈ لائف فوٹو گرافر قرار دیا گیا ہے۔ چند گھنٹ پہلے رات کو پیدا ہونے والے یہ گھڑیال کے بچے صبح کو اپنی ماں کے گروہ کی سب سے بوڑھی اور تجربہ کار گھڑیال نانی یا دادی کے اوپر سوار ہو کر کسی محفوظ جگہ کی طرف جا رہے ہیں کیونکہ یہ ابھی تیرنا نہیں جانتے۔ یہ تصویر قدرتی زندگی میں ایک دوسرے کا آسرا بننے کے لیے پائے جانے والے میل جول کو نمایاں کرتی ہے۔ کسی وقت ملک بھر کی ہر ندی میں یہ گھڑیال پائے جاتے تھے لیکن اب ان کی تعداد صرف دو سو کے آس پاس رہ گئی ہے۔

◄اس شمارے کی خاص تصویر: کمپیوٹر گرافکس کی مدد سے تیار کی گئی اس خوب صورت تصویر میں بجلی کے بلب کو برف جیسا دکھانے کی کوشش کی گئی ہے

Back Inner Cover

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات ملا رموزی (جلد اوّل حصہ اوّل)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 453
قیمت: -/151 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد اوّل حصہ دوم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 454تا896
قیمت: -/140 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد دوم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 750
قیمت: -/243 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد سوم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 710
قیمت: 235 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد چہارم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 875
قیمت: 279 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد پنجم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 428
قیمت: -/156 روپے

مقالاتِ مسعود

مصنف: مسعود حسین خان
صفحات: 230
قیمت: -/106 روپے

علامہ فضل حق خیر آبادی: چند عنوانات

مصنف: خوشتر نورانی
صفحات: 248
قیمت: -/91 روپے

تحقیق و تعارف

مصنف: حنیف نقوی
صفحات: 288
قیمت: -/99 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد اوّل)

مرتبہ: امتیاز وحید
صفحات: 354
قیمت: 118 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد دوم)

مرتبہ: امتیاز وحید
صفحات: 368
قیمت: 133 روپے

ہندوستانی تہذیب

مصنف: ابن کنول
صفحات: 399
قیمت: -/131 روپے

تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری

مصنف: عبدالغنی مدہوش
صفحات: 192
قیمت: -/67 روپے

جدید دنیا میں تعلیم

مصنف: نیاز احمد اعظمی
صفحات: 179
قیمت: -/73 روپے

تعلیمی نفسیات

مصنف: طلعت عزیز
صفحات: 242
قیمت: -/96 روپے

پودحفاظتی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال

مترجم: سید ظفر الاسلام
صفحات: 78
قیمت: -/64 روپے

پیٹ کے کیڑے

مصنف: محمد رفیق اے ایس
صفحات: 79
قیمت: -/40 روپے

حسن نعیم اور نئی غزل

مصنف: احمد کفیل
صفحات: 284
قیمت: -/104 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Front Inner Cover

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اُردو دُنیا

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in